رشید امجد
پت جھڑ میں خود کلامی

کتاب —— پت جھڑ میں خود کلامی

مصنف —— رشید امجد

سرورق —— حمید ساغر

کتابت —— اعجاز کھوکھر

ناشر —— اثبات پبلی کیشنز، راولپنڈی

مطبع —— ایس۔ٹی۔ پرنٹرز، دریاآباد، راولپنڈی

پہلی چھاپ —— ایک ہزار، اپریل ۱۹۸۴ء

قیمت —— تیس روپے

اثبات پبلی کیشنز، پوسٹ بکس ۲۴۸ راولپنڈی

سعدیہ،
حسن اور حسین
کے نام

سمندر اگر میرے اندر گرے
تو پایاب لہروں میں ڈھل کر سُلگنے لگے
پیاس کے بے نشاں دشت میں
وہیل مچھلی کی صورت تڑپنے لگے
ہارپونوں سے، نیزوں پر چھلنی بدن پر
دہکتی ہوئی ریت کے تیز نشتر کے سہے
اور پھر ریت پر جھاگ کے کچھ نشان چھوڑ کر
تا ابد سر بریدہ سے ساحل کے سائے میں
ہونے نہ ہونے کی میٹھی اذیت میں کھویا رہے

وزیر آغا

ترتیب

چپ فضا میں
تیز خوشبو

ریکارڈنگ ہال کی تیز روشنی میں ساری چیزیں تیرتی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں، اس کا اپنا آپ وجود کی تنگنائے سے نکل کر اوپر اُٹھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

سامنے والا کیمرہ مین ٹرالی کو آگے پیچھے کر کے زاویے درست کرتا ہے۔ دو نمبر کیمرہ نے اس کے ساتھ والے کو کور کرنا ہے، تین نمبر کیمرے نے بلے شاٹ لینے ہیں اور ٹائیٹل کو کور (COVER) کر کے منظر ایک نمبر کیمرے کو منتقل کر دینا ہے، پروڈیوسر باری باری تینوں کیمروں کے فوکس سے ان کی ترتیب ٹھیک کرنے کے لئے کرسیوں کو آگے پیچھے سرکاتا، میز کو ذرا ٹیڑھا کرتا ہے، پھر کہتا ہے —— "آپ سمجھ گئے نا، جب ایک نمبر کا کیمرہ مین انگلی سے دائرہ بنائے گا تو پروفیسر صاحب آپ گفتگو شروع کریں گے، بالکل نیچرل طریقہ سے، بغیر کسی تمہید کے، ٹائیٹل کے لانگ شاٹ کے فوراً بعد دو نمبر کیمرہ آپ کا کلوز اَپ لے گا، لیکن آپ نے براہِ راست کیمرہ کی طرف نہیں دیکھنا" پھر بائیں طرف والی روشنی کو دیکھ کر نفی میں سر ہلاتا ہے —— "اسے نوے کے زاویے پر لائیں۔"

نیلی وردی والا روشنی مین لمبی سی چھڑی سے لائٹ کو آگے پیچھے کر کے زاویہ درست کرتا ہے۔

پروڈیوسر ایک نمبر کیمرے سے اُن کی ترتیب چیک کرتا ہے اور اس کی طرف مُنہ کر کے کہتا ہے ـــــ "پروفیسر صاحب آپ لے کُرسی کے ہتھوں کو اتنی مظبوطی سے کیوں پکڑ رکھا ہے ؟"

وہ کیسے بتائے کہ اگر اُس نے ہتھیاں چھوڑ دیں تو اس کا سارا جسم کُرسی کی گرفت سے نکل کر فضا میں تیرنے لگے گا، لیکن وہ کچھ کہے بغیر گرفت ڈھیلی کر دیتا ہے، اور پاؤں پر بوجھ ڈال کر زمین کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔

پروڈیوسر اطمینان سے چاروں طرف دیکھتا اور کہتا ہے ـــــ "میں کنٹرول روم میں جا رہا ہوں، جب ایک نمبر کیمرہ مین اُنگلی سے دائرہ بنائے تو پروفیسر صاحب آپ ـــــ"

وہ سر ہلاتا ہے

پروڈیوسر کنٹرول روم میں چلا جاتا ہے،

ایک منٹ ـــــ دو منٹ

پھر تین آوازیں ایک ساتھ گونجتی ہیں

SILENT SILENT SILENT

ریکارڈنگ ہال میں سے زندگی رینگ رینگ کر باہر نکل جاتی ہے، اور موت دبے پاؤں اندر داخل ہوتی ہے۔

گہری گھُپ خاموشی

وہ تھُوک سے گلا تر کرتا ہے

لمحہ لمحہ گزرتا ہے ـــــ ٹک، ٹک، ٹک

نمبر ایک کا ہاتھ آہستہ آہستہ بلند ہوتا ہے، اُنگلی اٹھتی ہے، دائرہ بننے لگتا ہے،

وہ بولنے کے لئے مُنہ کھولتا ہے،

لیکن ـــــ لیکن آواز نہیں نکلتی۔

پسینہ کی لہر سارے جسم کو اپنے اندر لپیٹ لیتی ہے
وہ مُنہ کھولتا ہے ـــــ جُملہ یاد کرنے کی کوشش کرتا ہے، کیا عمدہ جُملہ سوچا ہوا تھا،
مگر ایک لفظ یاد نہیں آتا، مُنہ سے آواز ہی نہیں نکلتی
تیز روشنیاں چاروں طرف سے ٹوٹے پڑ رہی ہیں
لمحہ گزر رہا ہے
بولنے کی کوشش ـــــ آواز نہیں
گفتگو اُس نے شروع کرنی ہے، پھر ساتھ والے سے سوال کر کے اسے شامل کرنا،
اور پھر تیسرے ساتھی سے سوال ـــــ لیکن بات شروع ہو تو تب نا،
بولنے کی ایک اور کوشش
تھوک سے گلا تر کر کے ٹوٹے پھوٹے جملوں کو جوڑنے کی کوشش
لیکن آواز نہیں
کن انکھیوں سے ساتھ والوں کو دیکھتا ہے، دونوں اس کی طرف دیکھ رہے ہیں،
لیکن آواز؟
سارا زور لگا کر ایک بے ربط سا جُملہ بولنے کی کوشش،
لیکن ہونٹ سرسرا کر رہ جاتے ہیں۔
پروڈیوسر ابھی دوڑتا ہوا آئے گا ـــــ "یہ کیا ہو رہا ہے؟"
بس آتا ہی ہو گا

چیزیں آتی جاتی رہتی ہیں، کائنات کا سلسلہ بھی عجیب ہے، چیزیں جنم لیتی ہیں، اور پھر کسی بلیک ہول میں گُم ہو جاتی ہیں، ہر روشنی کے پیچھے ایک بلیک ہول ہے، ہر سانس بھی ایک بلیک ہول ہے کہ ہر سانس کے پیچھے موت کی دستک ہے، چھوٹی چھوٹی دستکیں اور پھر ایک لمبی اونچی دستک، وقت بھی ایک بلیک ہول ہے جو بالآخر ہر شے کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے

وہ بولنے کے لئے مُنہ کھولتا ہے لیکن آواز

لفظ گُم ہو گئے ہیں

بیوی کہتی ہے ــــ "پروگرام کا چیک اوپن کرا لینا، دس بارہ روپے رہ گئے ہیں اور ابھی تو چار پانچ دن باقی ہیں"

بیٹی ماں کے پہلو سے سر نکالتی ہے ــــ "ابُو گڑیا چابی والی ــــ آپ نے وعدہ کیا تھا نا، اب پروگرام ملے گا تو ــــ"

بیٹا توتلی آواز میں کہتا ہے ــــ "ابّا ــــ ابّا"

وہ آنکھیں جھپکاتا ہے،

ریکارڈنگ روم میں موت کی سی خاموشی ہے،

موت تو ایک خوشبو ہے جو دھیرے دھیرے ہر چیز پر نشہ طاری کر دیتی ہے اور اس نشہ کے عالم میں ہم چپکے سے ایک دائرے سے نکل کر دوسرے دائرے میں داخل ہو جاتے ہیں، اور یہ عجیب بات ہے کہ سارے حصّے فوری طور پر نہیں مرتے۔ بعض حصّے موت کے کئی دن بعد تک زندہ رہتے ہیں۔ بال اور ناخن قبر میں بھی بڑھتے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں ذہن کے بعض حصّے بھی موت کے کئی کئی دن بعد تک اپنا کام کرتے رہتے ہیں، یہ بھی کیا عذاب ہے کہ آدمی مر چکا ہے لیکن اس کے ذہن کے کچھ حصّے کام کر رہے ہیں اور وہ خود اپنی آخری رُسوم دیکھ رہا ہے، اچانک یا حادثاتی موت کی شکل میں تو بہت سے حواس اور کبھی کبھی وجود کا سُرمئی ہیولا بھی کئی کئی دن تک موجود رہتا ہے، لیکن پھر ایک چُپ

گہری چُپ

وہ چُپ کے پنجوں سے نکلنے کے لئے پھڑ پھڑاتا ہے، بولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن آواز نہیں نکلتی،

آغاز کے لئے کیا عمدہ جُملہ سوچا ہوا تھا، وہ جُملہ کیا تھا؟ تو کوئی اور جُملہ، لیکن لفظ تو اس

سے دُور بھاگ گئے ہیں۔

بولنے کی کوشش ——— آواز ؟

پسینے کے قطرے سارے چہرے پر پھیلتے جا رہے ہیں'

عینک کے اُوپر سے لڑکوں کو دیکھتا ہے'

کائنات بھی ایک جسم ہے۔ جیسے ہمارا یہ جسم جس کے اندر کئی دُنیائیں آباد ہیں جراثیموں سے بھری ہوئی دُنیائیں، اور ہمارا ذہن ان سب کو' پورے جسم کو کنٹرول کرتا ہے، کائنات بھی ایک جسم ہے اور ہم اس کے اندر چھوٹے چھوٹے جراثیم ہیں، اس کا بھی ایک ذہن ہے ایک ماسٹر مائنڈ'

گھنٹی کی آواز کے ساتھ ہی لڑکے کندھے جھٹک کر اس کی باتوں کو واپس اس کے منہ پر دے مارتے ہیں:

سٹاف روم میں ایک ساتھی کہتا ہے ——— "یار ذرا حساب کر کے تو بتاؤ نئے سکیلوں سے کتنا فرق پڑے گا؟"

"نئے سکیل"

"آج کا اخبار نہیں دیکھا، پے کمشن کی سفارشات"

"لیکن یہ تو صرف سفارشات ہیں، اصل تو خدا جانے کیا ہو گا؟"

"تو کیا ——— دل خوش کرنے میں کیا نقصان ہے؟"

پروڈیوسر کہتا ہے ——— "پروفیسر صاحب بات آپ شروع کریں گے، جونہی ایک نمبر انگلی سے دائرہ بنائے آپ ———"

وہ بولنے کی مسلسل کوشش کر رہا ہے، لیکن آواز نہیں نکلتی

معلوم نہیں آواز گم ہو گئی ہے یا لفظ ختم ہو چکے ہیں

آواز ایک پرندہ ہے

لفظ اس کی چہکار

سوچ ہفت رنگ فضا

نہیں شاید ——

لفظ ایک پرندہ

آواز چہکار

سوچ ——

نہیں نہیں —— شاید یوں

سوچ ایک پرندہ

لفظ اس کی چہکار

اور آواز ؟

آواز نہیں نکلتی، کوشش کے باوجود آواز نہیں نکلتی

بھاری غرارے والی خاموشی ریکارڈنگ ہال میں ٹہل رہی ہے

تیز روشنیاں —— کیمروں کی آگے پیچھے ہوتی بے آواز ٹرالیاں

فضا ایک انتہائی حساس مووی کیمرے کی طرح ہر حرکت، ہر آواز کو ریکارڈ کر رہی ہے

فضا میں ازل سے اب تک کی ہر حرکت، ہر آواز محفوظ ہے اور اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے۔ کیا معلوم اس لمحہ کائنات کے کسی حصّے میں اس کی تصویر بھی ری کاسٹ ہو رہی ہو، اور یہ بھی کیا معلوم کہ اس لمحہ جو کچھ ہو رہا ہے اس پر بیت رہا ہے وہ ری کاسٹ ہو اور اصل منظر کہیں اور ہو —— ہزاروں نوری سالوں کے فاصلہ پر کسی جگہ، وہ اس لمحہ یا اس سے ہزاروں سال پہلے موجود ہو اور یوں ہی بولنے کی کوشش میں بار بار مُنہ کھول رہا ہو اور آواز نہ نکلتی ہو،

لفظ بے وفا ہو گئے ہوں

وقت کے ساتھ ساتھ تو سب کچھ بے وفا ہو جاتا ہے، عمر بھی، دن بھی، یادیں بھی،

بس سب کچھ پاس سے گزر جاتا ہے ـــــ اور آدمی ہاتھ بڑھا بڑھا کر ہی رہ جاتا ہے ـــــ

لیکن پروگرام کے بعد اسے چیک ضرور اوپن کرانا ہے ، کسی کے سامنے نہیں ، بس کسی بہانے

سے کچھ دیر کے لئے رک جاتا ہے اور جب دوسرے دونوں چلے جائیں تو ـــــ

لیکن پروگرام ریکارڈ ہو تو تب نا ـــــ پروڈیوسر تو ابھی کنٹرول روم سے چینخنے ہی

والا ہے ـــــ " یہ کیا ہو رہا ہے ، آپ بولتے کیوں نہیں ؟"

وہ پھر بولنے کے لئے کچھ کہنے کے لئے مُنہ کھولتا ہے ،

پہلی میں ابھی چار دن باقی ہیں بلکہ پانچ دن ، تنخواہ تو دو ہی کو ملے گی نا ،

اور چیک اوپن ـــــ

لیکن بولنے کی ہر کوشش بے کار

آواز ساتھ چھوڑ گئی ہے ـــ بے وفا ہو گئی ہے

کیا کہے ؟ ـــــ کیسے کہے ؟

کتنے عمدہ عمدہ جملے سوچ کے آیا تھا ۔

ابھی گفتگو شروع کرنا ہے اور اختتام بھی ـــــ

پروڈیوسر نے کہا تھا ـــــ " جب آخری دو منٹ رہ جائیں گے تو نمبر ایک دو بارہ

اُنگلی سے دائرہ بنائے گا ، بس آپ بات نیچرل طریقہ سے اُچک لیں اور پانچ چھ اختتامی جملے

کہہ کر ختم کر دیں ۔"

لیکن ابھی تو ابتدائی جملے بھی نہیں کہے گئے ، اختتام کب اور کیسے ہو گا ؟

وہ پھر بات کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔

مسلسل بولنے کی کوشش میں ہونٹ پھڑ پھڑانے لگے ہیں ۔ ایک آخری کوشش کے

طور پر وجود کا سارا زور لگا کر ، ساری توانائیاں اکٹھی کر کے بولنے کے لئے مُنہ کھولتا ہے ـــــ

لیکن آواز نہیں نکلتی ، ہونٹوں کی سرسراہٹ کے ساتھ ساتھ اس کا وجود سکڑنے لگتا ہے ،

ریکارڈنگ ہال چھوٹے سے بلیک ہول کی طرح اسے اپنے اندر گم کر رہا ہے ___ اسے تیزی سے اپنے اندر سمیٹ رہا ہے۔ وہ ہاتھ پیر مارتا ہے، خود کو اس کی کشش سے بچانے کی کوشش کرتا ہے لیکن بے سود، بلیک ہول اسے تیزی سے اپنی طرف کھینچے چلا جاتا ہے، ایک گھنی تاریکی تیزی سے اس کے قریب آتی جاتی ہے، تیز روشنیاں پلک جھپکنے میں بجھ جاتی ہیں اور ریکارڈنگ ہال مختلف آوازوں سے گونجنے لگتا ہے، پروڈیوسر بھاگتا ہوا اندر آتا ہے اور کہتا ہے،

"واہ وا ___ کمال ہو گیا، بہت اچھی ریکارڈنگ ہوئی ہے، یہ پروگرام تو ہٹ جائیگا۔"
اور وہ ہڑبڑ اس کا منہ دیکھے جاتا ہے!

صبح سب سے پہلے بیوی نے دیکھا کہ وہ بستر پر نہیں ہے۔

کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد کہ باتھ روم میں نہ ہو، اُس نے سارے کمرے دیکھ ڈالے۔

باہر والا دروازہ اندر سے بند تھا، دوبارہ ایک ایک کمرہ دیکھا، پھر بڑے بیٹے کو جگایا۔

"کیا بات ہے؟" بڑا بیٹا ہڑبڑا کر اُٹھا۔

"تمہارے ابّو" آواز رندھ گئی۔

"کیا ہوا ـــــ کیا ہوا؟" بیٹا اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"تمہارے ابو ـــــ گھر میں نہیں ہیں"

بڑے بیٹے نے بے یقینی اور جھنجھلاہٹ سے اس کی طرف دیکھا۔ "کیا مطلب؟"

"میں نے ایک ایک کمرہ دیکھ لیا۔ وہ کہیں نہیں"

گفتگو سُن کر بیٹی بھی اُٹھ گئی۔ "تو پھر کہاں ہیں؟"

"باہر والا دروازہ بھی اندر سے بند ہے" اب آنسو رُکے نہیں رُکتے۔

چند لمحے عجیب پُراسرار سکوت۔

پھر وہ سب اپنے اپنے بستروں سے نکل کر اسے تلاش کرتے ہیں۔ باتھ روم میں،

سونے کے کمروں میں، ڈرائینگ روم میں، باورچی خانے میں، اسٹور میں

بڑا بیٹا کہتا ہے۔ "کہیں صبح سویرے باہر نہ نکل گئے ہوں۔"

ماں جھنجلا کر کہتی ہے۔ "لیکن دروازہ اندر سے بند ہے۔"

چھوٹا بیٹا چند لمحے سوچتا رہتا ہے۔ "کیا معلوم رات ہی کو گھر نہ آئے ہوں؟"

بیٹی نفی میں سر ہلاتی ہے۔ "میں نے خود دروازہ کھولا تھا، جب انہوں نے گھنٹی بجائی تھی۔"

چھوٹا بیٹا اسے گھورتا ہے۔ "تم تو ہر وقت اپنے ہی خیالوں میں رہتی ہو، کیا پتا وہ باہر ہی رہ گئے ہوں اور تم نے دروازہ بند کر لیا ہو۔ یا وہ گھنٹی ہی بجاتے رہے ہوں اور تم نے دروازہ کھولا ہی نہ ہو؟"

بیٹی غصے سے اسے دیکھتی ہے۔ "تم تو ہر وقت میرے ہی پیچھے رہتے ہو۔"

ماں بستر پر ہاتھ پھیرتی ہے۔ "رات کو وہ یہاں سوئے تھے۔"

بڑا بیٹا مشکوک نظروں سے ماں کی طرف دیکھتا ہے۔ "کیا معلوم؟"

چھوٹا بیٹا کہتا ہے۔ "مجھے ساری رات باہر کھڑکھڑ سنائی دیتی رہی ہے، میرا خیال ہے وہی ہوں گے۔ وہ ضرور رات کو باہر ہی رہ گئے ہیں۔"

"کیا معلوم وہ گھر ہی میں کہیں ہوں۔" ماں بڑبڑاتی ہے۔

وہ پھر اسے تلاش کرنے گھر کے کونے کونے میں پھیل جاتے ہیں۔

ایک ایک کمرہ دیکھتے ہیں۔

"رات کو انہیں کھانا کس نے دیا تھا؟" بڑا بیٹا ماں اور بہن کی طرف دیکھ کر سوال کرتا ہے۔

ماں کو یاد آتا ہے اس نے انہیں کھانا دیا تھا، پھر یاد آتا ہے شاید اس نے نہیں دیا تھا۔

بیٹی کو یاد آتا ہے شاید اس نے یا شاید اس نے نہیں۔

دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر چپ رہتی ہیں۔

"سوال ہے اب اُنہیں کہاں تلاش کیا جائے"؟ بڑا بیٹا بڑبڑاتا ہے۔

"کیوں نہ ان کے سارے دوستوں کے گھر فون کیا جائے، شاید دیر ہونے کی وجہ سے کہیں رُک گئے ہوں،" چھوٹا بیٹا رائے دیتا ہے۔

بیٹی جھنجلا کر کہتی ہے۔"مَیں نے خود دروازہ کھولا تھا، وہ رات کو گھر آئے تھے، کیوں امّی"؟

ماں کو کچھ یاد نہیں آتا۔ کبھی خیال آتا ہے وہ آئے تھے، اس نے ان کے لئے کھانا گرم کیا تھا ـــــ کھانا کھاتے ہوئے وہ باتیں کرتے رہے تھے پھر کتاب ـــــ کبھی خیال آتا ہے وہ آئے ہی نہیں، وہ ساری رات انتظار اوڑھ کر ان کی راہ تکتی رہی ہے۔

"کیوں امّی"؟

"لیکن فون کرنے میں کیا حرج ہے"؟

"دروازہ اندر سے بند ہے"۔ بڑا بیٹا بڑبڑاتا ہے۔"اس کا مطلب ہے وہ آئے ہی نہیں اور اگر آئے ہیں تو پھر کہیں گئے نہیں۔"

تو پھر کہاں ہیں؟

وہ پھر اُسے تلاش کرنے کے لئے گھر کے کونے کونے میں پھیل جاتے ہیں۔

ایک ایک کمرہ، ایک ایک کونا، ایک ایک الماری۔

"میرا خیال ہے وہ رات کو آئے ہی نہیں،" بڑا بیٹا صوفے میں گرتے ہوئے مایوسی سے کہتا ہے۔"امّی آپ بتائیں نا۔"

ماں کو کچھ یاد نہیں آتا۔ کبھی خیال آتا ہے اُس نے کھانا گرم ـــــ کبھی نہیں، ساری رات انتظار ـــــ

"مجھے کچھ پتا نہیں۔ کچھ معلوم نہیں۔" وہ روہانسی ہو جاتی ہے۔

بیٹی آگے بڑھ کر اسے سنبھالتی ہے۔ چھوٹا بیٹا فون کی طرف چلا جاتا ہے۔

بڑا بیٹا کہتا ہے۔"مَیں ذرا باہر تو دیکھ لُوں۔ کہیں وہ ابھی تک دروازے پر ہی نہ کھڑے

ہوں ۔"

وہ باہر جاتا ہے، پھر اندر آکر مایوسی سے سر ہلاتا ہے۔

ماں اب رونے لگتی ہے ۔" وہ کبھی رات کو باہر نہیں رہے یہ پہلی رات ہے ۔"

خالی بستر پر شکنیں ہیں بھی اور نہیں بھی ۔

وہ رات کو سوئے تھے یا شاید نہیں۔

تھوڑی دیر بعد چھوٹا بیٹا مُنہ لٹکائے آتا ہے" وہ کسی دوست کے یہاں بھی نہیں ۔"

"تو پھر کہاں گئے؟" اب بیٹی کی آنکھوں میں بھی آنسو جھلملانے لگے ہیں" کہیں میں نے واقعی انہیں باہر چھوڑ کر دروازہ بند نہ کرلیا ہو" ؟ کبھی یاد آتا ہے، وہ آئے تھے۔ گھنٹی کی آواز سُن کر اُس نے دروازہ کھولا تھا۔ انہوں نے اسے پیار کیا تھا۔ پھر اس کے پاس سے گزر کر اپنے کمرے کی طرف چلے گئے تھے۔ وہ دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ کبھی یاد آتا ہے گھنٹی کی آواز سُن کر اُس نے دروازہ ہی نہیں کھولا تھا۔ گھنٹی بار بار بجتی رہی تھی مگر اُس نے،

"نہیں نہیں وہ اندر آئے تھے ___ وہ اندر آئے تھے ۔" وہ ہذیانی انداز میں چیختی ہے۔

"وہ نہیں آئے تھے ___ نہیں ___ نہیں ۔"

ماں اور بڑا بیٹا اسے شانوں سے پکڑ کر صوفے میں دھکیل دیتے ہیں۔

چھوٹا بیٹا بڑبڑاتا ہے ۔" وہ آئے ہی نہیں ۔ اس نے دروازہ ہی نہیں کھولا ہوگا ۔"

بڑا بیٹا اُسے ڈانٹتا ہے" چُپ رہو۔"

خود وہ رات گئے تک ناول پڑھتا رہا تھا، کبھی یاد آتا ہے کہ گھنٹی کی آواز آئی تھی اور کسی نے دروازہ کھولا تھا اور کوئی اندر آیا تھا، کبھی یاد آتا ہے کہ گھنٹی بجی ہی نہیں۔

چھوٹا بیٹا اصرار کئے جاتا ہے ۔" رات کو کوئی ضرور باہر تھا، ساری رات کھڑکھڑ ہوتی رہی ہے ۔"

اُسے کبھی یاد آتا ہے کہ ساری رات کوئی دیواروں، کھڑکیوں اور دروازوں پر دستکیں دیتا رہا ہے۔ کبھی یاد آتا ہے کہ وہ ساری رات مزے سے سویا رہا، ذرا بھی آواز نہیں آئی۔

"تو وہ گھر کے اندر بھی نہیں ہیں اور باہر بھی نہیں۔" ماں افسوس سے سر ہلاتی ہے ــــ دنوں، سالوں اور مہینوں کے کئی بند تھان خود بخود کھُلتے چلے جاتے ہیں۔ رنگ برنگی کھٹی میٹھی تصویریں ـــــ ذائقے، کڑواہٹیں، مٹھاسیں۔ دُکھ سُکھ کے کئی بلے سال سمٹ کر سوئی کے ناکے میں سما جاتے ہیں۔

"تو وہ نہیں ہیں۔" وہ چیخ مار کر بیٹی سے لپٹ جاتی ہے۔

دروازہ اندر سے بند ہے، یا شاید نہیں ہے۔

کسی نے دوازہ کھولا۔ شاید نہیں کھولا۔

وہ ساری رات باہر ہی کھڑے رہے، یا اندر آ گئے۔

شاید ـــــ یا شاید نہیں۔

وہ سارے ڈرائنگ روم میں صوفوں میں دھنسے اپنے اپنے جہنم کو سمیٹ رہے ہیں، کوئی کچھ نہیں بولتا، بس کبھی کبھی سر اُٹھا کر ایک دوسرے کو دیکھ لیتے ہیں اور دوسرے ہی لمحے مجرموں کی طرح سر جھکا کر اپنے اپنے طوقوں میں دبک جاتے ہیں۔

ایک عجب پُراسرار خاموشی،

اور ان سب سے الگ وہ ـــــ جسے یہ سارے تلاش کر رہے ہیں، لکھنے کی میز پر بیٹھا سر جھکائے کتاب پڑھے جا رہا ہے، کبھی کبھی سر اُٹھا کر ان کی بوکھلاہٹیں، اداس چہرے اور مایوس باتیں سُنتا ہے اور پھر سر جھکا کر پڑھنے لگتا ہے۔

یہ کہانیاں بھی کم بخت عجیب ہوتی ہیں، کبھی شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جاتی ہیں اور کبھی شروع ہو کر ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتیں۔

سالگرہ کا کیک کاٹتے ہوئے دفعتہً اسے یاد آیا کہ پچھلی رات ٹیکسی سے اترتے ہوئے وہ خود کو پچھلی سیٹ پر بھول آیا ہے،

اس کی بیوی اور تینوں بچے ہیپی برتھ ڈے ٹو یو کرتے تالیاں بجا رہے تھے اور وہ چھُری ہاتھ میں پکڑے بوکھلائی نظروں سے انہیں دیکھے جا رہا تھا، تالیاں بجاتے بجاتے اس کی بیوی کو دفعتہً اس کی بوکھلاہٹ کا احساس ہوا تو اس نے پوچھا — "کیا بات ہے؟ تم ٹھیک تو ہو نا؟"

وہ مُنہ کھولے ہٹ بٹ دیکھتا رہا

"کیا بات ہے، کیا بات ہے؟" اب بچے بھی متوجہ ہو گئے

اُس نے بغیر کیک کاٹے چھُری میز پر رکھ دی اور کرُسی پر بیٹھ گیا

"کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟" بیوی اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی "خیریت تو ہے نا، تم ٹھیک ہو نا؟"

وہ ایک لمحہ خالی نظروں سے اسے دیکھتا رہا، پھر بولا — "کل رات میں خود کو ٹیکسی میں بھول آیا ہوں"

بیوی نے لمحہ بھر کے لئے حیرت سے دیکھا، لیکن اگلے ہی لمحہ جھنجلاہٹ اس کے سارے چہرے پر رینگنے لگی ـــــ "کیا؟"

"ہاں" وہ رُک رُک کر کہنے لگا "ٹیکسی جب گلی کی نکڑ پر رُکی تو بے خیالی میں میں خود کو پچھلی سیٹ پر ہی بھول گیا"

بیوی نے سر پر ہاتھ مارا اور بولی ـــــ "میرے خدایا، اگر تم خود کو بھول آئے ہو تو یہ کون ہے؟" اُس نے اس کے بازوؤں کو دبایا ـــــ "یہ کون ہے؟"

"ارے واقعی یہ کون ہے؟" اُس نے اپنے آپ کو اور پھر بچوں کو دیکھا جو حیرت سے مُنہ کھولے اُن کی باتیں سُن رہے تھے

"واقعی یہ کون ہے؟"

لمحہ بھر خاموشی رہی پھر بولا ـــــ "ہو سکتا ہے یہ وہی ٹیکسی ڈرائیور ہو جس کی ٹیکسی میں میں گھر آرہا تھا، یا پھر کوئی اور ہو ـــــ کوئی بھی"

"تمہارا تو دماغ چل گیا ہے" بیوی غصّہ سے بولی۔ "اُٹھو کیک کاٹو، بچّوں کو بھی پریشان کر دیا ہے"

"نہیں یہ میں نہیں ہوں" وہ آہستہ سے بڑبڑایا

"تو پھر یہ کون ہے؟" اُس نے اپنے آپ سے پوچھا ـــــ "اس کے وجود میں یہ کون ہے؟" کوئی اجنبی ـــــ لیکن کون؟

"اُٹھو کیک کاٹو" بیوی نے ہاتھ پکڑ کر اسے اُٹھایا ـــــ "دیکھو بچے پریشان ہو رہے ہیں"

اُس نے ویران نظروں سے بچوں کو دیکھا جو مُنہ کھولے اسے دیکھے جا رہے تھے

"تو ان کو بھی معلوم نہیں کہ یہ میں نہیں ہوں، عجیب بات ہے یہ میری خوشبو بھی نہیں پہچانتے، بالکل اپنی ماں کی طرح ہیں اور یہ عورت یہ جان کر بھی کہ یہ میں نہیں ہوں کیک کاٹنے

کی ضد کئے جا رہی ہے۔"

وہ بے دلی سے اُٹھا اور کیک کاٹنے لگا

بچوں اور بیوی نے ہیپی برتھ ڈے ٹو یو کا کورس شروع کیا لیکن اب ان کی آواز میں پہلے کی سی کھنک نہیں تھی۔

کیک کاٹتے ہوئے وہ مسلسل سوچتا رہا کہ وہ کہاں اپنے آپ کو بھولا تھا،

ٹیکسی مورس تھی اور ڈرائیور چھوٹے قد کا جس نے کالی جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ وہ پچھلی نشست پر بیٹھا تھا۔ اس کے اُترنے کے بعد شاید ڈرائیور کی نظر پچھلی نشست پر پڑی ہو اور اسے معلوم ہوگیا ہو کہ وہ وہیں رہ گیا ہے۔ یا کیا معلوم ڈرائیور نے مڑ کر دیکھا ہی نہ ہو اور اسی طرح ٹیکسی بند کر دی ہو ——— یا ——— ؟؟

ساری رات اسی بے چینی میں گزری، بار بار خیال آتا کہ کیا معلوم ڈرائیور نے مڑ کر دیکھا ہی نہ ہو اور وہ اسی طرح پچھلی نشست پر ہی پڑا ہو، پھر خیال آتا کہ شاید ڈرائیور نے مڑ کر دیکھ لیا ہو، لیکن کس لئے؟ یہ بھی ہو سکتا ہے ڈرائیور نے غیر اہم سمجھ کر کہیں پھینک دیا ہو، اور وہ ابھی تک کسی ویران سڑک کے کنارے پڑا ہو۔ سردی اور ویرانی اس کے بدن پر رینگنے لگیں، اُس نے کروٹ بدل کر گہری نیند سوتی بیوی کو دیکھا ——— "یہ عورت کتنی عجیب ہے، یہ جان کر بھی کہ یہ وہ نہیں ہے کتنے اطمینان سے سوئی ہوئی ہے ——— کتنے ہی برس بیت گئے لیکن اس عورت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، اُسی طرح بالکل اُسی طرح، اُس کے خوابوں اور خیالوں سے بالکل مختلف"

صبح ناشتہ کی میز پر بھی وہ چپ چپ تھا، بچے ایک دوسرے سے سلائس چھین رہے تھے، بیوی نے چائے بنا کر پیالی آگے کی اور بولی ——— "کس سوچ میں ہو؟"

وہ ایک لمحہ چپ رہا پھر بولا ——— "معلوم نہیں اب وہ ٹیکسی ملتی بھی ہے کہ نہیں، تھی تو مورس اور ڈرائیور ———"

بیوی نے غصّہ سے گھورا —— تو تم ابھی تک اُسی پاگل پن میں ہو —— یہ تمہیں کیا ہوتا جا رہا ہے —— کچھ عرصہ سے عجیب عجیب باتیں کرنے لگے ہو"

ناشتہ کر کے اُس نے بچوں کو سکول چھوڑا اور اسی جگہ آن کھڑا ہوا جہاں سے ٹیکسی پکڑی تھی، بس دُھندلا دُھندلا یاد تھا کہ مورس تھی اور ڈرائیور نے کالے رنگ کی جیکٹ پہن رکھی تھی، لیکن فوراً ہی خیال آیا کہ شاید مورس نہیں سنی تھی، یا نہیں یہ بھی نہیں —— شاید —— اور ڈرائیور نے کالے رنگ —— یا شاید نہیں ؟

ساری چیزیں عجب طرح دُھندلا گئی تھیں اور ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوئی جا رہی تھیں ۔ بے خیالی اور دُھندلائی آنکھوں سے ایک ایک ٹیکسی کو دیکھتا رہا ۔ کئی ٹیکسیوں پر شبہ بھی ہوا، دوڑ کر پہنچا، کئی ڈرائیوروں سے پوچھا، لیکن —— ؟

دن کروٹ لے کر شام کی گود میں سو گیا لیکن وہ اسی طرح پاگلوں کی طرح ٹیکسیوں کے پیچھے بھاگتا رہا ۔ رات گئے گھر آیا تو بیوی بچے پریشانی سے اُس کے منتظر تھے

"اتنی دیر"

"ابو آپ کہاں تھے ؟"

"ابو ——"

"ابو ——"

تھکاوٹ ، بے چینی اور اُداسی چاروں طرف منڈلا رہی تھیں ۔

بار بار خیال آتا کہ ابھی تک ٹیکسی کی پچھلی نشست پر ہی نہ پڑا ہو، دُھند چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اور چیزیں ایک دوسرے کی اوٹ میں چھپ گئی تھیں ۔

"یہ مَیں نہیں ہوں" اُس نے اپنے بدن پر ہاتھ پھیرا —— "یقیناً یہ مَیں نہیں ہوں بلکہ کسی کو اس کا احساس نہیں، بچوں کو بھی نہیں ، بیوی کو بھی نہیں"، اُس نے مُڑ کر دیکھا ——

"کس مزے سے سو رہی ہے یہ جان کر بھی کہ یہ وہ نہیں ہے"

کروٹیں بدلتی رات پچھے سے صبح کے روشن بطن میں اُتر گئی۔ اُس کے اداس اُترے ہوئے چہرے کو دیکھ کر بیوی نے پوچھا ——— "تو تم ابھی تک اُسی چکر میں ہو"

اُس نے سر ہلایا لیکن کچھ کہا نہیں، کہتا بھی کیا ——— مکالمہ کے لیئے دونوں طرف کے سیٹوں کی فری کیونسی ایک سی ہونا چاہیئے ورنہ آواز کی بجائے شاں شاں ہی سُنائی دیتی ہے ———

اُس دن بھی وہ چوراہوں پر مختلف ٹیکسیوں کے پیچھے بھاگتا رہا، یہ ہو، شاید یہ ——— نہیں یہ نہیں ——— شاید وہ ———؟

اب اُسے بالکل یاد نہیں آرہا تھا کہ وہ ٹیکسی کسی ماڈل اور مارکہ کی تھی، مورس، سنی، ٹیوٹا۔ یا، ڈرائیور چھوٹے قد ——— نہیں لمبے قد، شاید درمیانہ، جیکٹ کالی، بھوری، نیلی ——— یا،

سب کچھ گہری دُھند میں گڈ مڈ ہو گیا تھا۔

کچھ یاد نہیں، بس یاد ہے تو اتنا کہ پچھلی سیٹ پر وہ، اپنے وجود کی ساری خوشبوؤں، تمناؤں اور خوابوں کے ساتھ اُس لفافہ میں تھا، دفعتہً اسے خیال آیا کہ لفافہ پر پتہ تو تھا، شاید ڈرائیور نے اسے پوسٹ کر دیا ہو۔ یہ خیال آتے ہی خوشبوؤں، تمناؤں اور خوابوں کے لذت بھرے لمس اس کے سارے وجود پر پھیل گئے، لمبی لمبی غلافی آنکھوں" مسکراتے سُرخ ہونٹوں اور کھلے گلاب ایسے روشن چہرے کے ساتھ وہ لمحہ بھر کے لیئے اس کی آنکھوں میں آئی ——— کیا معلوم خط اسے مل ہی گیا ہو اور اس وقت وہ اپنی آرام کرسی پر نیم دراز مزے مزے سے اسے پڑھ رہی ہو،

لیکن کیا معلوم؟

کوئی جواب بھی تو نہیں آیا ———!

لاشئے کا آشوب

اندھیرا جونہی شام کی طنابیں توڑ کر رات کے خیمے سے باہر نکلتا ہے، وہ دبے پاؤں اندر داخل ہوتے ہیں اور کہتے ہیں ـــــ "چلو، ہمارے ساتھ چلو"

وہ اپنے جسم کے ملبے سے خوشبو کی صورت اٹھتا ہے،

وہ کہتے ہیں ـــــ "چلو بستر اٹھاؤ اور ہمارے ساتھ چلو"

وہ نفی میں سر ہلا کر کہتا ہے ـــــ "نہیں، پہلے مکالمہ ہوگا"

وہ ہنستے ہیں ـــــ "وقت اور موت کبھی مکالمہ نہیں کرتے"

وہ ان کی بات سُنے بغیر ضد کئے جاتا ہے ـــــ "نہیں پہلے مکالمہ، پھر میں تمہارے ساتھ چلوں گا"

وہ جواب نہیں دیتے اور کمرے میں پاؤں پسار کر لیٹے سناٹے میں سما جاتے ہیں۔

وہ کھڑکی کے نیچے بہتے دریا کا ہاتھ پکڑ کر نیچے اُتر آتا ہے، اور کنارے کنارے چلنے لگتا ہے۔ دریا اس کی پرواہ کئے بغیر چپ چاپ بہتا رہتا ہے۔ چند لمحے اس کی توجہ کا انتظار کرنے کے بعد جھنجلا کر کہتا ہے ـــــ "تم مجھے پہچانتے کیوں نہیں؟"

دریا کھلکھلا کر ہنستا ہے ـــــ "وقت اور دریا کسی کو نہیں پہچانتے"

"لیکن میں ـــــ" اس کی آواز میں گئے دنوں کی کائی اور زمانوں کا زنگ جم جاتا ہے۔

تمہیں یاد نہیں، میں کبھی یہاں سے گزرا تھا، کس طمطراق کے ساتھ، تم میرے قدموں میں جھکے تھے۔"

دریا چپ رہتا ہے

"اور میں نے تمہارے کناروں پر اپنے قدموں کے کتنے ہی نشان ثبت کئے تھے،" تاسف اس کی آواز میں سرسرانے لگتا ہے ——— "تب فتح میرے قدموں سے قدم ملا کر چلتی تھی، اور اب ———"

سامنے اس کا مقبرہ ہے،

سنسان، خاموش، دبیز سناٹا اس کے گرد کنڈل مارے بیٹھا ہوا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا مقبرے کے احاطہ میں آجاتا ہے سامنے اس کی قبر ہے۔ بیمار دیا دق کے مریض کی طرح ٹھہر ٹھہر کر، کانپ کانپ کر قبر کے سرہانے کھانس رہا ہے۔

"تو یہ میری قبر ہے"

اداسی احاطے میں بوند بوند ٹپک رہی ہے،

"میں ——— جس کے لئے وقت رک جایا کرتا تھا، جس کے نام کے بغیر تاریخ نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا تھا ——— تو یہ میں، اب اس ٹوٹی قبر کی صورت باقی رہ گیا ہوں، شاید مدتوں سے کسی نے فاتحہ بھی نہیں پڑھی"

وہ دریا کی سمت آن کھڑا ہوتا ہے۔

دریا اسے دیکھ کر مسکراتا ہے،

"تو تم مجھے پہچان گئے ہو" اس کے لبوں پر مسکراہٹ کا نور آنکھ کھولتا ہے،

دریا ہنکارا بھرتا ہے ——— "وقت اور دریا کسی کو یاد نہیں رکھتے اور تم ——— تمہیں تو تمہارے اپنے بیٹے بھی بھول گئے ہیں"

وہ مڑ کر دریا کے دوسرے کنارے سے پلٹے شہر پر نظر ڈالتا ہے، نیند میں بڑبڑاتے

لوگ کروٹ بدل کر سو جاتے ہیں، سارے دروازے اندر سے بند ہیں، لیکن گلیوں اور سڑکوں پر اس کے قدموں کے نشان اب بھی چمک رہے ہیں۔ دن بھر ڈیزل چھوڑتی بسیں، ٹرک، کاریں، تانگے اور سکوٹر فرش کو کھرچ کھرچ کر اس کے نشانات مٹانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں لیکن جونہی اندھیرا رات کے خیمے سے اڑیل گھوڑے کی طرح بدک کر باہر نکلتا ہے، یہ نشان سر اٹھاتے ہیں۔ وہ رینگ رینگ کر ان نشانوں سے نکلتا ہے اور اندھیرے میں گردن گردن ڈوبی گلیوں اور سڑکوں پر گھومنے لگتا ہے، ایک ایک دروازے پر دستک دیتا ہے۔

"کون"؟

"میں ــــ دروازہ کھولو"

لیکن کوئی دروازہ نہیں کھلتا،

وہ پھر دستک دیتا ہے

"کون"؟

"میں ــــ دیکھو میں تمہارا نام ہوں، تمہاری پہچان ہوں ــــ دروازہ کھولو"

جواباً گہری گھنیری چپ

"تو کیا میں نہیں ہوں" ــــ وہ اپنے آپ سے پوچھتا ہے، پھر اپنے سارے وجود پر ہاتھ پھیر کر اطمینان کرتا ہے کہ وہ ہے،

"دیکھو میں ہوں ــــ میں اب بھی ہوں"

مگر وہی گہری گھنیری چپ

اور نہ ہونے کی رات ــــ

ہو کر بھی نہ ہونا ــــ

لاحاصلی کا عذاب ــــ بوند بوند اس پر گرتا ہے

جب رات اپنے بادبان کھولتی ہے، اور اندھیرا ہمک کر باہر نکلتا ہے تو اس نہ

ہونے کی رات کے پاؤں پھیل جاتے ہیں۔

میں ہوں بھی کہ نہیں

ایک کھنڈر جس کے در و دیوار پر وقت چمگاڈروں کی بیٹھوں کی صورت نقش کندہ کرتا جاتا ہے،

دریا اور وقت نہ کسی کا ساتھ دیتے ہیں، نہ کسی کے لئے رُکتے ہیں اور نہ کسی کو پہچانتے ہیں'

تو میں کوئی بھی نہیں

اگر کوئی تھا بھی تو اب کچھ نہیں

فرش ٹوٹے احاطے ہیں جہاں ہر وقت سناٹا پاؤں پسارے خراٹے رہتا ہے، ایک شکستہ قبر ہے' جس کی لوح پر لکھی تاریخ اپنے واقعات سمیت سمٹتی جاتی ہے ـــــ ایک ٹوٹا دیا جس کا تیل اور بتی دونوں اتنے بوڑھے ہوگئے ہیں کہ ہر سانس پر کھانستے ہیں'

لاحاصلی کا عذاب

ہو کر بھی نہ ہونا

نہ ہونے کی رات ـــــ ہر رات

اور ہر رات جب اندھیرے رات کے کوزے میں قید جن کی طرح آزاد ہوتا ہے تو وہ آجاتے ہیں اور کہتے ہیں ـــــ "چلو بستر اٹھاؤ اور ہمارے ساتھ چلو"

تب وہ دیکھتا ہے کہ کمرے کی چھت اور دیواریں بوسیدگی کے پنجوں میں پھڑپھڑا رہی ہیں۔

"اب میرے لئے جانے اور نہ جانے میں کیا فرق باقی رہ گیا ہے؟"

لیکن وہ اصرار کئے جاتے ہیں ـــــ "چلو"

وہ کہتا ہے ـــــ "آؤ پہلے مکالمہ کریں"

لیکن مکالمے سے وہ بہت گھبراتے ہیں، سارا شہر ہی مکالمے سے گھبراتا ہے۔ وہ سب کچھ بغیر مکالمے کے کرنا چاہتے ہیں، ان کا کہنا ہے موت اور وقت کبھی مکالمہ نہیں کرتے،

لیکن اُس نے تو وقت سے مکالمہ کیا تھا، اور موت ـــــ موت تو تب اس کے سائے کے پیچھے چھپتی پھرتی تھی!

مگر اب موت دندناتی اس کے تعاقب میں چلی آتی ہے، اور وقت مکار عورت کی طرح دیدے نچا نچا کر کہتا ہے ـــــ "میں کسی سے مکالمہ نہیں کرتا ـــــ"

اب وہ کھوکھلے درخت کی طرح ہے جس کے تنے میں پرندوں نے آلنے بنا لئے ہیں، یہ درخت اپنی عمر گزار چکا ہے، اب ان پرندوں کے سہارے جی رہا ہے، اور یہ دریا ـــــ اب اسے دیکھ دیکھ کر ہنستا ہے، کبھی کہتا ہے میں تجھے نہیں پہچانتا اور کبھی پہچان کی چٹکیاں بھر کر اس کے نیم مُردہ جسم میں گدگدی کرتا ہے ـــــ اور یہ قبر، وہ پھر قبر کے پاس آ کھڑا ہوتا ہے ـــــ یہ قبر اب فاتحہ کے لئے ترستی ہے، ٹمٹماتا دیا آخری ہچکیاں لے رہا ہے۔

تو یہاں اب کوئی فاتحہ پڑھنے نہیں آتا

شاید کوئی آئے گا بھی نہیں، کسی کو اب اس قبر کی یاد نہیں، شاید ضرورت بھی نہیں ـ

سب اپنے اپنے خوابوں میں گم ہیں

اور قبریں تو ہمیشہ اکیلی اور تنہا ہوتی ہیں۔

اکیلی اور تنہا

اور ماضی صرف میوزیم اور کھنڈروں میں باقی رہ جاتا ہے

وہ چند لمحے سوچتا رہتا ہے، پھر خود بخود اس کے دونوں ہاتھ اُوپر اٹھ جاتے ہیں۔

اور وہ جو فاتحوں کا فاتح تھا، اپنی قبر پر خود ہی فاتحہ پڑھنے لگتا ہے!

بند ہوتی
آنکھوں میں
ڈوبتے سورج
کا عکس

اس کے گھر کا دروازہ گم ہو گیا ہے، اور اب اندر جانے کا کوئی راستہ نہیں،

وہ اس جگہ جہاں اس کے اندازے کے مطابق دروازہ ہونا چاہیئے تھا، حیرانی، پریشانی کے بوجھ تلے دبا کھڑا ہے۔ یاد آتا ہے کہ صبح جب وہ دفتر جانے کے لئے نکلا تھا تو دروازہ موجود تھا، بیوی ڈیوڑھی تک آئی تھی۔ بیٹے نے بسکٹوں کے ڈبہ کی فرمائش کی تھی، بیٹی نے کاپیوں کے لئے کہا تھا اور اب بسکٹوں کا ڈبہ ہاتھ میں پکڑے وہ گم سُم اس جگہ کھڑا ہے جہاں اس کے اندازے کے مطابق دروازہ ہونا چاہیئے تھا، لیکن دروازہ نہیں ہے۔ بس ایک سنگین حصار ہے جس نے سارے گھر کو اپنے کنڈل میں دبایا ہوا ہے، اُس نے دیوار کو کئی جگہ سے ٹٹول کر، چھو کر، دبا کر دیکھا ہے مگر کہیں کوئی راستہ نہیں، بس ایک مضبوط دیوار ہے جو اُوپر اٹھتی چلی گئی ہے اور گھر اس کے اندر، کہیں اس کی بغل میں دبکا بیٹھا ہے، اس نے آوازیں بھی دی ہیں مگر آواز دیوار سے ٹکرا کر واپس منہ پر آلگتی ہے تو وہ اب کیا کرے؟

اندھیرا تھکے ہوئے پرندے کی طرح تیزی سے زمین کی طرف گرتا چلا آرہا ہے، اور اس کے پیچھے پیچھے سردی رتھ میں سوار دوڑی چلی آتی ہے۔

تو وہ کیا کرے؟

اندر جانے کا راستہ گُم ہو گیا ہے۔

اور وہ اس جگہ جہاں اس کے اندازے کے مطابق دروازہ ہونا چاہیئے تھا۔ حیرانی کی چادر میں لپٹا خاموش کھڑا ہے۔

ایک عجیب خوفناک، ملبوترے چہرے والا خوف دبے پاؤں گلی میں چلا آتا ہے۔ اس کے بیوی بچے کہاں ہیں؟

گھر کہاں ہے؟

یہ دیوار ہے تو گھر کدھر ہے؟

گھر ہے تو دروازہ کہاں ہے؟

صبح دروازہ یہاں تھا، گھر بھی، دروازہ بھی،

بیوی ڈیوڑھی میں آئی تھی، بیٹے نے بسکٹ لانے کے لئے کہا تھا، بیٹی نے کا پیاں، وہ گلی میں ہوتا، سلام دعا کرتا، بڑی سڑک تک آیا تھا، بس میں بیٹھ کر دفتر پہنچا تھا، دن بھر فائلوں پر لفظوں اور قوانین کی شطرنج کا کھیل۔

مگر اب گلی کے ہونٹ چُپ ہیں، چہرہ بے پہچان،

وہ کبھی ایک طرف، کبھی دوسری طرف جاتا ہے، لیکن اندر جانے کا راستہ نہیں ملتا، اس کے اندازے کے مطابق جس جگہ دروازہ ہونا چاہیئے تھا، وہاں کچھ بھی نہیں، بس ایک دیوار سی ہے جو اوپر اٹھتی چلی گئی ہے دستکیں دے دے کر اس کے ہاتھ شل ہو گئے ہیں، دیوار سے کان لگا کر سُننے کی کوشش کرتا ہے ــــــ گہری خاموشی۔

مُڑ کر گلی میں دیکھتا ہے ــــــ گہری خاموشی۔

اور اس گہری چُپ خاموشی میں وہ اندر جانے کی تمنّا میں قطرہ قطرہ گھلتا جاتا ہے۔

اندھیرا اور سردی بھوکے شکاری پرندوں کی طرح چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے ہیں۔

دروازہ گُم

اور گلی سُنسانی کے دریا میں ڈبکیاں کھا رہی ہے۔

اُسے خیال آتا ہے کہ صبح سے اس نے سوائے چائے کے کچھ بھی نہیں کھایا ـــــ اندر، گھر کے اندر ـــــ باورچی خانہ میں اس کی بیوی گرم گرم روٹیاں اُتار رہی ہوگی، دونوں بچے چوکیوں پر بیٹھے سبق یاد کر رہے ہوں گے ـــــ سالن کی پتیلی سے اُٹھتی ذائقہ دار گرم خوشبو چٹخارہ ـــــ بھوک اس کی انتڑیوں میں سیٹیاں بجاتی تیز تیز چلتی ہے۔

وہ بسکٹ کے ڈبے کو کھولتا ہے۔ رُک جاتا ہے ـــ یاد آتا ہے کہ بیٹے نے بڑے اصرار سے بسکٹ لانے کے لئے کہا تھا، رُک کر سوچتا ہے اور دروازہ تلاش کرنے کے لئے دائیں بائیں جاتا ہے۔ پتھر کی ٹھنک دیوار اُوپر اُٹھتی چلی گئی ہے، وہ اس خُنکی کو پوروں پر محسوس کرتا ہے، پھر زور زور سے بیوی اور بچوں کو آوازیں دیتا ہے۔

شُوکتی سردی اور بھونکتا اندھیرا مُنہ چھپا کر اندر ہی اندر ہنستے ہیں۔

بھُوک اب اس کے سارے جسم میں دوڑتی پھر رہی ہے۔

پیکٹ کھولتا ہے، بسکٹ نکال کر مُنہ میں رکھنے لگتا ہے، رُکتا ہے، پھر جلدی سے مُنہ میں ڈال لیتا ہے۔

گاڑھا اندھیرا آسمان کی طرف مُنہ کر کے بھونک رہا ہے، سردی شور مچاتی ساری گلی میں ککلیاں ڈال رہی ہے۔

وہ ٹھٹھر کر دیوار کے ساتھ لگ جاتا ہے
بیوی کا مسکراتا چہرہ، بچوں کی میٹھی باتیں
وہ اب کھانا کھا کر سونے کے کمرے میں چلے گئے ہوں گے۔

گرم بستر
اس کی آنکھوں میں ایک لہر سی اٹھتی، بیٹھ جاتی ہے۔

سونے کا کمرہ تو گلی کی طرف ہے، شاید اس کی آواز اُن تک پہنچ جائے ـــــ مگر کیا

معلوم سونے کا کمرہ دوسری طرف ہو۔

ذہن میں گھر کے نقشے کو مرتب کرنے کی کوشش،

ڈیوڑھی کے سامنے صحن، دائیں طرف سونے کا کمرہ، بائیں طرف ڈرائینگ روم،

سونے کا کمرہ بائیں طرف ـــــ نہیں بائیں طرف تو سٹور ہے اور دائیں طرف ـــــ

نہیں سونے کا کمرہ بائیں ـــــ دائیں، ڈرائینگ روم، سونے کا کمرہ، باورچی خانہ ـــــ

دائیں بائیں ـــــ نہیں بائیں دائیں ـــــ دائیں بائیں ـــــ بائیں دائیں ۔

تو جس جگہ وہ اس وقت ہے اس کے قریب سونے کا کمرہ ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی۔

کیا خبر ہو ہی؟

شاید اس کی آواز سن لیں،

آواز دینے کے لئے مُنہ کھولتا ہے مگر ـــــ

نام ـــــ لفظ ـــــ بیوی کا نام ہی یاد نہیں آتا،

بیٹے اور بیٹی کا نام یاد کرنے کی کوشش کرتا ہے

اُن کے نام بھی یاد نہیں آتے ـــــ

بیوی ـــــ بیٹا، بیٹی ـــــ نام، لفظ ـــــ ایک گہری چُپ۔

"مَیں ـــــ مَیں" وہ چیختا ہے۔

مگر فوراً ہی خیال آتا ہے ـــــ "مَیں کون؟"

نام بے نشان، بے پہچان

لفظ بے معنی، بے چہرہ

سمندروں سے بھی گہرا اندھیرا اور موجیں مارتی سردی،

رات پینجے کی طرح تیزی سے اندھیرے کو دُھنک رہی ہے،

اندھیرے کے ڈھیر کے ڈھیر لگ گئے ہیں۔

منجمد ہوتا جسم، خواہشوں کے بھنور
ڈوبتے ڈوبتے ـــــ ابھرنے کی تمنّا
کسی طرح دیوار میں سَن لگائی جائے۔
تیزی سے جیبیں ٹٹولتا ہے، مگر بال پوائنٹ کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا ـــــ ایک رومال، چند سکّے، بسکٹوں کا خالی ڈبہ اور دو کاپیاں،
وہ لکھتا ہے ـــــ
میرا نام ـــــ میرا نام کیا ہے؟
میری پہچان ـــــ میری پہچان کیا ہے؟
میرے بیوی بچے ـــــ میرے بیوی بچے کہاں ہیں؟
میرا گھر ـــــ میرا گھر کہاں ہے؟
اندر جانے کی تمنّا ـــــ مگر راستہ نہیں ہے، راستہ کہاں ہے؟
ہر جملہ کے بعد ایک سوالیہ نشان ـــــ بال پوائنٹ کی سیاہی ختم ہو جاتی ہے ـــــ
لفظ بے ترتیب ـــــ نام بے چہرہ، بے پہچان
دیوار کے ساتھ ساتھ گھسٹتا دھم سے زمین پر گر پڑتا ہے،
بھوک کی چنگاریوں میں شعلے بھڑکنے لگے ہیں،
اکڑتے جسم کو ہلانے کی کوشش میں وہ لڑکھڑا لڑکھڑا کر کھڑا ہوتا ہے۔
گھسٹ گھسٹ کر دیوار کو ٹٹولتا ہے
کبھی اِس طرف، کبھی اُس طرف
بیوی بچوں کے نام یاد کرنے کی کوشش
نام یاد نہیں آتے،
آواز دینے کے لئے منہ کھولتا ہے،

آواز نہیں نکلتی

نہ لفظ ہیں —— نہ آواز —— نہ پہچان،

بس ایک سنگین، ٹھنڈی دیوار ہے، سنسان اندھیری گلی اور ٹھٹھرتی ہوئی سردی،

وہ ناخنوں سے دیوار کو کھرچتا ہے،

ذہن میں گھر کا نقشہ اور کمروں کی ترتیب یاد کرتا ہے۔

سونے کا کمرہ بائیں یا دائیں

ڈرائینگ روم اِدھر یا اُدھر

اندر جانے کا راستہ —— ؟

اس کے اندازے کے مطابق جہاں جو ہونا چاہیئے تھا وہ وہاں نہیں ہے بس ایک دیوار ہے —— یا شاید وہ بھی نہیں ہے۔

رات بیتتی جا رہی ہے

شاید نصف بیت گئی ہے یا شاید نہیں

شاید صبح ہونے والی ہے یا شاید نہیں ہونے والی،

صبح ہونے تک وہ شاید —— یا شاید نہیں

کچھ معلوم نہیں —— کوئی بات یقینی نہیں،

بس دُور دُور تک پھیلا ہوا اندھیرے اور سردی کا تنبو ہے، منجمد کرتی سردی اور کلبلاتی بھوک بھونک بھونک کر اسے بھنجھوڑ رہی ہیں، بھنجھوڑ بھنجھوڑ کر بھونک رہی ہیں، اور پُرانے سوئیٹر کی طرح تیزی سے اُدھڑتے ہوئے وہ نہ کچھ سوچ رہا ہے، نہ دیکھ رہا ہے، نہ سُن رہا ہے۔

بس تیزی سے اُدھڑتا ہی چلا جا رہا ہے۔

اُدھڑتا ہی چلا جاتا ہے۔

انکشاف کا یہ لمحہ،

یہ عجب بے ڈھنگے چہرے، سوکھی لٹکتی زبان والا لمحہ۔

موڑ مڑتے ہی دفعتہً احساس ہوتا ہے کہ اس کے پیچھے کوئی نہیں ہے۔

تیزی سے گھوم کر دیکھنا، بریکوں پر پاؤں کا دباؤ،

پاؤں پسارے لیٹی سڑک پر کاروں، رکشاؤں، بسوں اور سکوٹروں کی قطاریں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے رینگ رہی ہیں۔

وہ دُور دُور تک کہیں دکھائی نہیں دیتی

سڑک کے بیچوں بیچ یوں یکدم رُک جانے سے رینگتی قطاریں اُلٹ پلٹ ہو جاتی ہیں

ہارن کی مسلسل آوازیں، گھورتی آنکھیں اور بڑبڑاتے لب ـــــ وہ تیزی سے موٹر سائیکل فٹ پاتھ کی طرف گھسیٹتا ہے۔

پچھلے اشارے تک تو وہ ساتھ تھی، شاید کوئی بات بھی کی تھی۔

نہیں پچھلے اشارے پر وہ اُس کے ساتھ نہیں تھی

اس سے پچھلے اشارے پر ـــــ شاید نہیں

ٹریفک کا لہریں مارتا دریا کسی نامعلوم منزل کی طرف رواں ہے

کیا معلوم وہ جب کسی اشارے پر چند لمحوں کے لئے رُکا ہو تو وہ چپکے سے اُتر گئی ہو ؟

یا کہیں جھٹکا لگا ہو اور وہ گر گئی ہو ؟

کیا معلوم ؟

شاید وہ ابھی تک پچھلے اشارے پر ہی کھڑی ہو ؟

یا جہاں گری ہو وہاں پڑی ہو اور موٹریں ، رکشا ، بسیں اور سکوٹر اُس کے اُوپر سے گزر رہے ہوں ۔

موٹر سائیکل مڑتا ہے ۔

پچھلے اشارے پر چند لمحوں کے لئے رُکی ٹریفک زبان باہر نکالے ہانپ رہی ہے اس کی بھوکی نظریں بے چینی سے منظر کو چاٹتی ہیں ۔

شاید اس سے پچھلے اشارہ پر

پچھلے اشارے سے اُس سے بھی پچھلے اشارے تک منظر کرچ کرچ بکھرا ہوا ہے اِس کی ٹٹولتی آنکھیں ایک چھکر سے دوسرے چھکر کی سیڑھیاں چڑھتی اور اُترتی ہیں ۔

دن ورق ورق کھلتا ہے ۔

صبح وہ ایک ساتھ گھر سے نکلے تھے ،

گلی کا موڑ مڑتے ہوئے اس نے کہا تھا ـــــ "پہلے ذرا درزی کی طرف"۔

درزی کی دکان کے سامنے وہ اُتری تھی ، دکان کے اندر بھی گئی تھی ، لیکن باہر نکلنا ؟

شاید وہ درزی کی دکان سے باہر ہی نہ آئی ہو اور وہ اس کے بغیر ہی وہاں سے چل پڑا ہو ؟

نہیں ـــــ وہ سر جھٹکتا ہے ۔ بڑی سڑک پر جب وہ بس سے آگے نکلنے کی کوشش میں ایک کار سے ٹکراتے ٹکراتے رہ گیا تھا تو اس نے کندھا دباتے ہوئے کہا تھا ـــ "اتنی تیزی کیوں دکھاتے ہو ؟"

کیا معلوم عین اُسی وقت جب وہ بل کھا کر کار کی زد سے بچا تھا، وہ سڑک پر گر گئی ہو؟

لیکن پھر یاد آیا کہ آگے جا کر وہ پٹرول پمپ پر رُکا تھا، وہ نیچے اُتری تھی۔

تو کہیں وہ پٹرول پمپ پر ہی نہ رہ گئی ہو ــــ وہ اُسے بٹھائے بغیر وہاں سے چل پڑا ہو؟

لیکن پھر فوراً خیال آیا کہ اس کے بعد انہوں نے ایک جنرل سٹور سے کچھ سامان خریدا تھا۔

تو شاید وہ جنرل سٹور ہیں۔

کیریئر پر سامان کا تھیلا رکھا ہوا ہے، شاید وہ تھیلا اُٹھا لایا ہو اور اُسے وہیں چھوڑ آیا ہو اور وہ ابھی تک ــــ،

لیکن سٹور سے باہر نکل کر اُس نے ایک بھکاری کو روپیہ دیا تھا

تو شاید وہ اسی بھکاری کے پاس کھڑی ہو۔

نہیں ــــ نہیں، اِس کے بعد، اُس کے بعد بھی

تو پھر

تو ہم کہاں جا رہے تھے

شاید وہ راستہ میں کہیں اُتر کر پہلے ہی وہاں پہنچ گئی ہو۔

بہت سوچتا ہے ــــ کچھ یاد نہیں آتا کہ وہ جا کہاں رہے تھے، گھر سے کیوں نکلے تھے، کسی کے پاس جانے کے لئے، پٹرول ڈلوانے کے لئے، جنرل سٹور سے کچھ خریدنے کے لئے، بھکاری کو روپیہ دینے کے لئے ــــ معلوم نہیں وہ گھر سے کیوں نکلے تھے، اور گھر، گھر کہاں ہے؟ ــــ کچھ یاد نہیں آتا۔

تو یہ بھی معلوم نہیں کہ کہاں سے آ رہے تھے اور کہاں جا رہے تھے؟

ایک عجب طرح کی دُھند ہے کہ جس میں دکھائی بھی دیتا ہے اور نہیں بھی دیتا۔ کوئی جگہ

ضرور ہے جہاں اُنھوں نے جانا تھا۔ لیکن کہاں یہ معلوم نہیں۔ گھر بھی کہیں ہے جہاں سے وہ
آرہے تھے، مگر کہاں ہے یہ معلوم نہیں؟

ایک عجب طرح کی دُھند ہے

دوپہر ڈھل کر سُرمئی شام میں گھُلتی جارہی ہے۔ وہ اسی طرح فٹ پاتھ کے ساتھ موٹرسائیکل
ٹکائے کھڑا کا کھڑا ہے

وہ راستہ میں کہیں

؟

درزی کی دکان پر، جنرل سٹور میں، پٹرول پمپ پر آگے، پھر آگے یا پیچھے، بہت پیچھے،
شاید پچھلے اتوار کو یا اس سے پچھلے، یا اس سے بھی پچھلے۔

سر جھٹکتا ہے اور شروع سے دن کی تہیں کھولنے لگتا ہے

گھر سے نکلتے ہوئے، درزی کی دکان، جنرل سٹور، پٹرول پمپ

سُرمئی شام گہرے اندھیرے میں ڈھلتی جارہی ہے

سڑک آہستہ آہستہ ویران ہوگئی ہے اور سردی دبے پاؤں اس کے بدن پر قدم قدم چلتی ہے
دن کی تہیں کھُلتی ہیں، بند ہوتی ہیں پھر کھُلتی ہیں

لیکن دن تو جا چکا ہے

اب ٹھنڈی انگلیوں والی رات اس کے بدن کو ٹٹول رہی ہے۔

شاید وہ ابھی تک کسی سڑک کے کنارے، یا درزی، یا جنرل سٹور —— یا،

رات نے اپنے چہرے پر پڑا گھونگھٹ اُلٹ دیا ہے، سردی بال کھولے، بازو پھیلائے
اس کے چاروں طرف ناچ رہی ہے

ویران سڑک —— تھوڑے تھوڑے وقفے سے ایک آدھ گاڑی یا سکوٹر گزرتا ہے تو
لمحہ بھر کے لئے روشنی پھیلتی، پھر مرجھا جاتی ہے

گھُپ اندھیرا —— اور ناچتی ٹھنڈ،

وہ اسی طرح کھڑا کا کھڑا، دن کی تہیں کھولتا، لپیٹتا، پھر کھولتا ہے۔

سردی نے اب اُسے اپنی بانہوں میں بھینچ لیا ہے۔

کانپتے جسم، بجتے دانتوں اور یخ ہوتے ہاتھوں سے وہ دن کی تہیں کھولنا چاہتا ہے،

لیکن اس کے سامنے دُھند ——— چیزیں سمٹنے مٹنے لگتی ہیں۔

دُھندلی یادوں میں ——— صبح گھر سے نکلنا، درزی کی دکان، جنرل سٹور، پٹرول پمپ

پہلا، دوسرا، تیسرا ——— اور پھر دُھند ——— ایک عجب دُھند جس میں دکھائی

دیتا بھی ہے اور نہیں بھی

اور آتش دان کے سامنے بیٹھی ٹی وی دیکھتے ہوئے وہ سوچتی ہے ——— آج پھر اس

نے دیر کر دی ہے، کھانا پھر ٹھنڈا ہو جائے گا۔

قافلے سے بچھڑا غم

قدموں کے نشان شہر کی ناف تک تو آتے دکھائی دیتے ہیں، آگے پتہ نہیں چلتا، بس ایک خراٹے لیتا سناٹا ہے کہ چوکڑی مارے بیٹھا ہے، اور وہ جو قافلہ سے بچھڑ گیا ہے شہر کے بیچوں بیچ اکیلا کھڑا سوال پہ سوال کئے جا رہا ہے، سنسان سڑکیں اور ویران گلیاں اُس کے سوال سُن کر ہبڑ ببڑ دیکھتی ہیں اور اپنی خالی جھولیاں اس کے سامنے الٹ دیتی ہیں۔

منظر یہ ہے

دکانوں میں چیزیں سجی ہیں، کاؤنٹر کھلے پڑے ہیں، لیکن آدمی نظر نہیں آتے

ہوٹلوں میں میزوں پر کھانے کی چیزیں ترتیب سے رکھی ہیں، لیکن نہ کوئی کھانے والا ہے، نہ کھلانے والا،

بس سٹاپ خالی پڑا ہے، بس کھڑی ہے، انجن سٹارٹ ہے لیکن نہ ڈرائیور ہے نہ کنڈیکٹر، نہ کوئی سواری،

سڑک پر کاروں، بسوں اور سکوٹروں کی لمبی قطار ہے، انجن سٹارٹ ہیں، لیکن آدمی کوئی نہیں،

اس شہر کے لوگ کہاں گئے ہیں؟ وہ اپنے آپ سے پوچھتا ہے اور بڑے چوک کی

طرف چل پڑتا ہے،

اشارہ بند ہے، سُرخ بتی زبان باہر نکالے ہانپ رہی ہے،

تو یہ ٹریفک اسی طرح بند رہے گی، لیکن لوگ ـــــ لوگ کہاں گئے ہیں؟

شاید گھروں میں بند ہیں؟

دستک

خاموشی

دستک ـــــ کوئی ہے؟

خاموشی

وہ دروازہ کھول کر اندر چلا جاتا ہے، باورچی خانہ میں چولہا جل رہا ہے، دیگچی میں سالن پک رہا ہے لیکن کوئی دکھائی نہیں دیتا ـــــ ڈرائنگ روم، بیڈ روم، سٹور کہیں بھی کوئی نہیں،

یا خدا یہ کیا طلسم ہے کہ گھر سجے سجائے، دکانیں بھری پڑی، سڑکیں، کاروں، بسوں اور سکوٹروں سے ٹھسا ٹھس لیکن آدمی کوئی نہیں خوف اس کے بدن پر رینگنے لگتا ہے،

وہ بغیر کسی ارادے کے، بغیر کسی سمت کا تعین کئے دوڑ پڑتا ہے،

دوڑتا رہتا ہے ـــــ ہانپنے لگتا ہے تو رُک جاتا ہے،

یہ تو کوئی سکول ہے

شاید یہاں کوئی ہو ـــــ یہاں ضرور کوئی ہو گا

کوئی ہے؟

کوئی ہے ـــــ کوئی ہے، اس کی اپنی آواز چاروں طرف سے اس پر ٹوٹ پڑتی ہے۔ وہ نڈھال ہو کر چند قدم پیچھے ہٹ جاتا ہے ـــــ بہت دیر اسی طرح کھڑا رہتا ہے، پھر اپنے آپ کو اکٹھا کر کے آگے بڑھتا ہے ـــــ کلاس روم میں ڈیسکوں پر بستے

کھلے پڑے ہیں، کاپیاں کھُلی ہیں، بلیک بورڈ پر سوال لکھا ہوا ہے، لیکن نہ پڑھانے والا موجود ہے نہ پڑھنے والے، ایک گہری چُپ ہے،

یا خُدا یہ کیا جادُو ہے ـــــ لوگ اس شہر سے کہاں گئے ہیں،

ہلکی سی آہٹ ہوتی ہے

کون ـــــ اس کے اندر تجسّس کی بُو پھٹتی ہے،

آہٹ قریب آتی محسوس ہوتی ہے، ہلکی سی چڑ چڑاہٹ ـــــ ایک چُوہا گردن باہر نکالتا ہے، چُوہا آہستہ سے سامنے آتا ہے، چند لمحے اس کی طرف دیکھتا ہے، پھر دوڑتا ہوا سامنے کے دروازے سے باہر نکل جاتا ہے،

تو کیا شہر کے سارے لوگ چوہے بن کر زمین کے نیچے چلے گئے ہیں؟

منظر وہی ہے،

سڑکوں پر کاریں، بسیں، سکوٹر اور سائیکل اپنی روانگی کی حالت میں ہیں، لیکن نہ کوئی چلانے والا ہے، نہ سفر کرنے والا، بس انجن چل چل کر آپ ہی آپ بوڑھے ہوئے جا رہے ہیں؛

گھروں میں چوُلہے جل رہے ہیں، سالن اور روٹیاں پک رہی ہیں، لیکن نہ کوئی کھانے والا ہے نہ کھلانے والا،

ہوٹلوں کی میزوں پر کھانے سجے ہوئے ہیں لیکن ـــــ

دفتروں میں فائلیں میزوں پر کھُلی پڑی ہیں، لیکن کرُسیاں خالی ہیں

تو کیا شہر کے سارے لوگ چوُہے بن کر زمین کے نیچے چلے گئے ہیں، تو کیا اسے بھی ـــــ اسے بھی

کوئی چیز اس کے اندر اُچھلتی ہے،

بانسری کی مدھم آواز آہستہ آہستہ اُبھرتی ہے اور لمحہ بہ لمحہ تیز ہونے لگتی ہے، کونوں

کھدروں سے چوہے سیلاب کی طرح اُچھل اُچھل کر باہر نکلتے ہیں اور بسوں، کاروں،
سکوٹروں، گھروں، دفتروں، ہوٹلوں اور درس گاہوں میں پھیل جاتے ہیں، بانسری کی آواز
اب چاروں طرف پھیل گئی ہے ————

رُکی چیزیں دفعتہً چل پڑی ہیں،
اس کے پیٹ کی گہرائیوں میں کوئی چیز اُچھلتی ہے، اور پھسلتی ہوئی اس کے حلق میں
آن اٹکتی ہے، وہ مُنہ کھول کر اسے اُگل دینا چاہتا ہے، لیکن اُچھلتی شے باہر نہیں نکلتی،
اندر ہی اندر اُچھلتی رہتی ہے، وہ چیختا ہے، چیخ آدھی باہر نکلتی ہے اور منجمد ہو جاتی ہے۔
آدھی اندر، آدھی باہر
حلق میں اٹکی شے اندر ہی اندر گھومتی ہے
وہ اُچھل اُچھل کر مُنہ سے بے ہنگم آوازیں نکالتا ہے،
اردگرد کھڑے لوگ ہنستے، تالیاں بجاتے ہیں اور جیبوں سے سکّے اور نوٹ
نکال نکال کر اس کے سامنے پھینکتے جاتے ہیں؛

کھلے دروازے پر دستک

شام کی بانسری سے نکلتی اندھیرے کی تان گہری ہوتی جاتی ہے۔

سامنے والی دیوار اور اس پر بیٹھا کبوتر دھیرے دھیرے رُوئی کے گالوں ایسے نرم اندھیرے میں ڈوبے جا رہے ہیں، نیچے صحن کی کھردری اینٹوں پر بے چینی سے اِدھر اُدھر آتی جاتی بلّی پنجوں سے اینٹیں کریدتی ہے، اس کی تیز غُرّاتی میاؤں میاؤں سُن کر کبوتر چوکنّا ہو کر چاروں طرف دیکھتا ہے، دیوار کی اونچائی پر نظر کرتا ہے اور پھر دبک کر بیٹھ جاتا ہے۔ بلّی صحن میں بے چینی سے پھر رہی ہے۔ دیوار پر چڑھنے کی کوشش کرتی ہے، لیکن چند فٹ کے بعد پھسل کر واپس صحن میں آ جاتی ہے۔ سر اُٹھا کر کبوتر کو دیکھتی، ہونٹوں کو سسکارتی، میاؤں میاؤں کرتی ہے۔

صحن کے سامنے والے کمرے میں بیڈ پر لیٹا وہ کھُلے دروازے سے سارا منظر دیکھ رہا ہے اس نے کئی بار ہش ہش کر کے بلّی کو بھگانے کی کوشش کی ہے لیکن بلّی کچھ دیر کے لئے اِدھر اُدھر ہوتی ہے، پھر چند ہی لمحوں بعد کبوتر کے گرم خون کی مہک اسے صحن میں واپس کھینچ لاتی ہے وہ صحن کی کھُردری اینٹوں کو پنجوں سے کُریدتی میاؤں میاؤں کرتی ہے۔ کبوتر اس کی بھُوکی میاؤں میاؤں سُن کر چوکنّا ہوتا، اِدھر اُدھر دیکھتا، پھر مطمئن ہو کر پَروں میں سمٹ جاتا ہے، شام کی

بانسری سے نکلتی اندھیرے کی تان گہری ہو گئی ہے۔

کبوتر اور دیوار تاریکی زم دبازت میں ڈوب گئے ہیں۔ کبوتر کا سفید ہیولہ بس ایک نشان سا ہے۔

اُسے خیال آتا ہے —— کبوتر صبح سے پہلے کہیں نہیں جائے گا اور یہ بلّی ——
بلّی مایوس ہو کر غصّے سے چکر کاٹتی ہے اس کی بھوک سے لتھڑی میاؤں میاؤں میں چیر پھاڑنے والی غراہٹ شامل ہوتی جا رہی ہے۔

بیڈ پر لیٹے لیٹے اسے اپنا آپ کبوتر میں تبدیل ہوتا محسوس ہوتا ہے۔ تیز پنجوں اور چمکیلی آنکھوں والی بلّی دبے پاؤں اس کے پیچھے آتی ہے۔ وہ سمٹ سمٹ کر دیوار کے ساتھ لگ جاتا ہے، ساتھ والے پلنگ پر سوئی اس کی بیوی اس کے بوجھ سے گھبرا کر کروٹ لیتی ہے وہ کہنی کے بل بستر پر گر جاتا ہے، چند لمحے یوں ہی پڑا رہتا ہے پھر صحن میں نکل آتا ہے۔
کبوتر سامنے والی دیوار پر سفید دھبا بنا دبکا بیٹھا ہے۔ بلّی اسے دیکھ کر صحن سے غائب ہو جاتی ہے۔ پانی پی کر وہ واپس بیڈ پر آتا ہے اور ٹکٹکی باندھے صحن کو دیکھتا رہتا ہے۔ بلّی جا چکی ہے اور ابھرتی چاندنی میں سامنے دیوار پر بیٹھا کبوتر صاف نظر آ رہا ہے۔

دیوار کے اختتام پر ایک اور اُوپر اٹھتی دیوار ہے جس کے بعد ساتھ والوں کی چھت ہے وہ سوچتا ہے بلّی کا وہاں پہنچنا ناممکن ہے۔ ساتھ والوں کا دروازہ بند ہو چکا ہے اس لئے ان کے کوٹھے تک بلّی نہیں پہنچ سکتی اور اگر پہنچ بھی جائے تو سیدھی دیوار پر وہ اتنا نیچے نہیں اُتر سکتی،
لیکن بلّی ہے کہاں؟
وہ اُٹھ کر صحن میں آتا ہے۔ بلّی کہیں دکھائی نہیں پڑتی۔ اُوپر دیوار کو اور پھر چھت کو دیکھتا ہے اور بستر پر آ گرتا ہے۔

موت بلّی کی طرح نفس کے کبوتر کا تعاقب کرتی ہے۔ کبوتر لاکھ بچنے کی کوشش کرکے کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں اس کی جھپٹ میں آ ہی جاتا ہے۔ گرم خون بھی کیا چیز ہے؟ چیز میں

بھی کیا ہیں کوئی بلّی ہے کوئی کبوتر ـــــــ کبوتر بلّی ہوتا تو کیا اور اگر بلّی کبوتر ہوتی تو پھر بھی کیا،

دفعتہً اس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ سارا صحن چاندنی میں نہایا ہوا ہے۔ دیوار پر بیٹھا کبوتر پروں میں سر دیئے گہری نیند کے سپنوں میں ہے۔ وہ چاروں طرف نظر گھماتا ہے اچانک ساتھ والوں کی چھت پر ہیولہ سا دکھائی دیتا ہے۔ وہ ہڑبڑا کر دروازے میں آتا ہے ـــــــ ساتھ والوں کی چھت پر بلّی بڑی آہستگی سے اِدھر اُدھر پھر رہی ہے ـــــــ وہ حیرت سے سوچتا ہے یہ اُوپر کیسے پہنچی، کیا دروازہ کھلا تھا، وہ ڈیوڑھی میں جاتا ہے۔ دروازہ بند ہے تو پھر ـــــــ شاید کسی نالی سے یا ـــــــ

وہ گھبرایا سا صحن میں آتا ہے۔ بلّی ساتھ والوں کی چھت پر ٹہل رہی ہے۔ وہ چھت سے دیوار کے زاویے اور اونچائی کا اندازہ کرتا ہے اور نفی میں سر ہلاتا ہے۔ بلّی نیچے کبھی نہیں پہنچ سکتی ـــــــ بالکل نہیں ـــــــ ممکن ہی نہیں، کچھ دیر صحن میں کھڑے رہنے اور دیوار و چھت کا اندازہ کرنے کے بعد بستر پر آلیٹتا ہے اور تکیئے کو ذرا سا ٹیڑھا کر کے کبوتر پر نظریں جما دیتا ہے کبوتر بلّی کی ان ساری کارروائیوں سے بے خبر مزے سے دیوار پر بیٹھا کسی خوشبو دار خواب کے سحر میں ڈوبا ہوا ہے۔ آہستہ آہستہ نیند اس کے پپوٹوں کو سہلانے لگتی ہے۔ نیند کی نرم نرم سیڑھیاں اُترنے سے پہلے وہ نیم واغنودتی آنکھوں سے اُوپر بلّی اور نیچے کبوتر کو دیکھتا ہے اور آہستہ سے نفی میں سر ہلاتا ہے ـــــــ ناممکن!

جبر اور ظلم طاقت ور مقناطیس کی طرح چیزوں اور ماحول کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں اور انہیں اپنے پنجوں میں دبا کر توڑ پھوڑ دیتے ہیں۔ یہ تو ایک کیفیت ہے جو دکھائی نہیں دیتی صرف محسوس کی جاسکتی ہے۔

بلّی کی آنکھوں میں بھی ایک مقناطیس ہوتا ہے اور وہ ـــــــ!

اُسے لگتا ہے کوئی چیز اس کے سینہ پر کودی ہے۔ ہڑبڑا کر اٹھتا ہے سامنے دیوار پر بلّی کبوتر سے تھوڑے سے فاصلہ پر بیٹھی آخری چھلانگ کی تیاری کر رہی ہے اس کا

منہ کھلا کا کھلا رہ جاتا ہے۔ حیرت سے پھڑپھڑاتی آنکھوں سے کبھی چھت کو کبھی دیوار کی اونچائی اور کبھی کبوتر اور بلّی کو دیکھتا ہے۔ کبوتر کی گردن اس کے پروں میں ہے اور بلّی چمکیلی آنکھیں اس پر جمائے قدم قدم آگے کھسک رہی ہے —— اُسے سانس رُکتا سا لگتا ہے خیال آتا ہے کہ زور سے چیخے اور بھاگ کر کوئی چیز اٹھا کر بلّی کی طرف پھینکے، لیکن فاصلہ —— اونچائی —— نہ اس کے منہ سے آواز نکلتی ہے، نہ پاؤں حرکت کرتے ہیں، بلّی ایک انچ اور آگے سرک آئی ہے اور اب ایک ہی لمحہ میں کبوتر پر جست لگانے والی ہے، بس ایک ہی لمحہ —— اور عین اسی لمحہ کبوتر ایک دم آنکھیں کھولتا ہے اور چشم زدن میں لمبی اڈاری مار کر اندھیری فضا میں گم ہو جاتا ہے۔ بلّی کے اُٹھے پنجے فضا ہی میں معلق رہ جاتے ہیں۔ وہ بچوں کی طرح اُچھلتا اور ہنستا چلا جاتا ہے لیکن اگلے ہی لمحے دھاڑیں مار مار کر رونے لگتا ہے رونے کی اونچی آواز سن کر اس کی بیوی جاگ پڑتی ہے، ساتھ والے کمرے سے بچے دوڑے آتے ہیں کیا ہوا —— کیا ہوا؟ خیر تو ہے۔ وہ روتے روتے ایک لمحہ کے لئے حیران بیوی بچوں کو دیکھتا ہے اور بھرائی ہوئی آواز میں کہتا ہے —— ”کبوتر کو تو اس کی چھٹی حس نے بچا لیا —— میری تو چھٹی حس بھی ختم ہو چکی ہے۔“

اور وہ دوبارہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگتا ہے!

تماشا عکس تماشا

اُس نے زہر پی لیا ہے، اور اب موت کا انتظار کر رہا ہے '

وہ یہی کہتے ہیں کہ یا تو چُپ چاپ ہمارے پیچھے پیچھے چلتے آؤ، یا پھر زہر پی لو'

وہ زندہ رہنا چاہتا ہے، لیکن یُوں بغیر جانے بُوجھے زندہ رہنا بھی کیا ؟

زندگی کے رنگوں کو اپنی آنکھ دیکھنا، اپنے کانوں سُننا، سوال کرنا، لیکن سوال کرنے کی اجازت ہی نہیں، بس دوسروں کے جواب ہی میں سے اپنا سوال تلاش کرنا، ــــــ

سوار گھوڑے سے اُتر کر لمحہ بھر توقف کرتا ہے، پھر کہتا ہے ــــــ "جناب آپ واپس چلے جائیں"

"کیوں ؟"

"شہر کے لوگ نہیں چاہتے کہ آپ ان کے پاس آئیں"

"لیکن کیوں ؟" انہوں نے تو خود ہمیں خط لکھ کر بلوایا ہے، اب ان کے دل کیسے بدل گئے ؟"

دل تو اُن کے اب بھی آپ کے ساتھ ہیں لیکن تلواریں ــــــ "

اور وہ کہتے ہیں چُپ چاپ چلے آؤ، بولو کچھ نہیں '

زندگی کو دوسروں کی آنکھ سے دیکھنا بھی عجب تجربہ ہے'
نیزے پر ٹنگا سر آنکھیں کھولتا ہے، مسکراتا ہے ——— "میں کٹ کر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہوں"

یہ بات سن کر وہ غراتے ہیں' اور دوڑتے ہوئے گلیوں میں گھس جاتے ہیں، صحنوں میں لوریاں دیتی عورتیں سہم جاتی ہیں، وہ جھپٹ کر بچوں کو پنگوڑوں میں سے اٹھا لیتے ہیں اور پھر اس سے پہلے کہ کوئی کچھ سمجھے، کہے، کرے، بچوں کی گردنیں مروڑ کر انہیں پنگوڑوں میں پھینک دیتے ہیں،

مروڑی ہوئی گردنوں والے بچے پنگوڑوں میں جوان ہوتے ہیں'
طوفانی اندھیری رات میں ندی کی لہروں پر تیرتی ٹوکری میں سلامت گردن والا بچہ آپ ہی آپ مسکراتا ہے'

دور کنارے پر منتظر گوپیاں ایک دوسرے کو دیکھ کر شرماتی ہیں، اور وہ جو اُن سب میں نکھری نکھری سی ہے سر اٹھا کر ندی کی سمت دیکھتی ہے
"اُس نے کہا تھا جب طوفان ندی کی تہوں میں اترنے لگے تو میں آؤں گا"
وہ غراتے ہوئے دوسری گلیوں کی طرف بڑھتے ہیں، عورتیں پنگوڑوں میں پڑے بچوں کو اٹھا کر اندر والے کمروں میں بھاگ جاتی ہیں'

"میں کچھ کہنا چاہتا ہوں"
"چپ ——— چپ"
"لیکن"
"لیکن کچھ نہیں ——— یا چپ یا پھر یہ زہر ———"
سارے راستے بند ہیں
وہ اپنا دھنش پھینک کر منہ موڑ لیتا ہے ——— "میں یہ سب کچھ نہیں کر سکتا"

کالے گھور بادلوں میں مسکراہٹ چمکتی ہے —— "یہ تو اپنی بقا ہے"

"لیکن یہ کیسی بقا ہے. جس کے لئے فنا کے دریا سے گزرنا پڑتا ہے"

مسکراہٹ گھنی ہو جاتی ہے —— "بقا، فنا ہی کی ٹہنی کا پھول ہے"

منتظر گو بیوں میں وہ نکھری نکھری سی سر اٹھا اٹھا کر ندی کی طرف دیکھے جاتی ہے —— " وہ ضرور آئے گا، وہ دُکھ میں آنے کا پابند ہے، اور میں نے اسے پکارا بھی تو ہے"

"حاضر جناب"

"تمہارا نام"

جناب میرا کوئی نام نہیں —— نام تو اب ایک سوکھی ٹہنی ہے، میرا تو اب صرف نمبر ہے ۲۲۷۲۴-۸۰۰-۴۰ — ۲۱۱، جناب یہاں اب محلوں اور گلیوں کے بھی نمبر ہی ہیں، نام تو اب بس گئے دنوں کی خوشبو ہیں اور خوشبو لوٹ کر کب آتی ہے!"

"تو تمہارا شہر؟"

"جناب میرا شہر بھی اب نمبر ہے، زپ نمبر، پھر اس کے اندر نمبر —— شہروں کے اندر شہر اور ان کے اندر اور شہر —— تہہ در تہہ شہر ہی شہر"

وہ کسی بہت ہی اندر کے شہر کی بہت ہی اندر کی گلی کے، بہت ہی اندر کے مکان میں پیدا ہوا ہے اور اب اندر اندر سے رس رس کر بہت اُوپر اُوپر آنا چاہتا ہے ——

وہ کہتے ہیں —— "تو چلے آؤ —— بے شک چلے آؤ، لیکن بولنا مت"

وہ کہتا ہے —— "لیکن"

"لیکن کچھ نہیں"

وہ کہتا ہے —— ؟

وہ کہتے ہیں —— ؟

کوئی کچھ نہیں کہتا، بس تماشا دیکھتا ہے کہ تماشا دیکھنے سے کسی کا کوئی حرج نہیں ہوتا،
لیکن تماشا بھی آخر کب تک دیکھا جا سکتا ہے، اس لئے اُس نے زہر پی ہی لیا ہے
اور اب موت کا انتظار کر رہا ہے، لیکن موت تو اس شہر ہی سے رُوٹھی ہوئی ہے۔
اور تماشا دیکھتے دیکھتے اب خود تماشا بن بیٹھا ہے،
زہر اندر ہی اندر اُسے کھوکھلا کئے جا رہا ہے، لیکن موت نہیں آتی، بس ٹکر ٹکر
موت کی راہ دیکھے جانا،
تو پھر اُس نے زہر پی ہی لیا ہے!

خواب آئینے

میں، وہ اور دوسرے سب تصویر کی ناتکمیلی کا نوحہ ہیں
ایسا نوحہ کہ جس کا نہ کوئی عنوان ہے، نہ موضوع،
پہلی سطر سے ماتم شروع ہوتا ہے، اور آخری سطر، لیکن آخری سطر تو ابھی لکھی ہی نہیں گئی، اس آخری سطر کو لکھنے کے لئے میں، وہ اور دوسرے سب کبھی دن کے روشن کاغذ پر لکیریں کھینچتے ہیں، اور کبھی رات کے سیاہ بدن پر نقطے بناتے ہیں، منظر سائے ایک دوسرے میں کہیں اتنے مدغم ہیں کہ پہچان نہیں ہو پاتی، اور کہیں اتنے دُور دُور کہ فاصلے دھاگے کے گولوں کی طرح پھیلتے کھلتے چلے جاتے ہیں، لیکن آخری سطر نہیں لکھی جاتی،

ماتم ہے کہ پہلی سطر ہی سے شروع ہو گیا ہے، اُمید ہے کہ ماچس کی بھیگی تیلی کی طرح ہے کہ ہے تو ہی لیکن روشنی نہیں ہوتی،
روشنی شناخت کی کُنجی ہے

میں، وہ اور دوسرے سب دن کے روشن بازاروں اور رات کی کالی گلیوں میں اسے تلاش کرتے کرتے اپنے آپ کو بھی کھو بیٹھے ہیں، اور اب ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں،

"میں کون ہوں؟"

"تم کون ہو؟"

"وہ کون ہے؟"

وہ جو خوشبو کی طرح محسوس تو ہوتی ہے دکھائی نہیں دیتی

(لیکن خوشبو تو صرف اُن کے لئے ہے جو سُونگھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں)

۲

اُفق کی سیڑھیاں اُترتے اُترتے سورج کا پاؤں پھسلتا ہے اور وہ لڑکھڑا کر اس کی گود میں آن گرتا ہے،

ویگن کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہوئی وہ، جلدی سے اُسے چادر کی بُکل میں چھپا لیتی ہے۔ کَن انکھیوں سے دوسروں کو دیکھتی ہے اور چادر کے اندر ہی اندر سُورج کے چمکتے چہرے پر انگلیاں پھیرنے لگتی ہے، پھر آپ ہی آپ مسکرائے چلی جاتی ہے،

نرم نرم اندھیرا ہائی وے کو اپنی مٹھیوں میں دبوچ لیتا ہے،

ویگن پوری رفتار سے اندھیرے کے سینے میں دُور نیچے اُترتی چلی جاتی ہے،

وہ فرنٹ سیٹ پر سورج کو چادر میں چھپائے، مسکرا رہی ہے

اور اس کی پچھلی سیٹ پر بیٹھا وہ اُسے مسلسل دیکھتا چلا جا رہا ہے

"میری کُنجی ـــــــ میں کتنے عرصے سے تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں، اب میں اپنے آپ کو کھولنا چاہتا ہوں"

اُس کی بُڑبُڑاہٹ سُن کر ساتھ والا اُس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتا ہے

ہم فرض کر لیتے ہیں کہ پہلے کا نام و اور دوسرے کا ب ہے

د کہتا ہے ——— "میں اب اپنے آپ کو دیکھنا چاہتا ہوں، مدتوں سے بند اس تالے کو کھولنا چاہتا ہوں"

ب سر ہلاتا ہے ——— "اب تو شاید ان تالوں پر اتنا زنگ چڑھ گیا ہے کہ کنجی مل بھی جائے تو کون جانے یہ تالے کھل بھی سکیں گے ——— لیکن کنجی بھی کہاں ہے؟"

د مسکراتا ہے ——— "کنجی تو مل گئی ہے ——— لیکن یہ بے مروتی بھی عجب شے ہے"

ب کچھ نہ سمجھتے ہوئے سر ہلا دیتا ہے

روشن پہر کے کبھی کبھی کتنے اندھیرے ہو جاتے ہیں؟ لیکن چادر کے نیچے سورج کو چھپا لینے سے سورج چھپ تو نہیں جاتا

وہ من ہی من میں مسکراتی ہے اور چادر کے اندر ہی اندر سورج کے چمکتے پہر پر اپنی نرم نرم انگلیاں پھیرتی ہے

د کہتا ہے ——— "کہانی سناؤں تمہیں"

ب کہتا ہے ——— "سناؤ، لیکن سنو میں درویش نہیں، میرے پاس جوابًا کوئی کہانی نہیں"

"تو سنو میں وہ ہوں جس نے اسے کھو دیا ہے، میں اس کے انتظار میں پتھر ہو گیا ہوں"

"کہیں تم نے پیچھے مڑ کر تو نہیں دیکھ لیا تھا"

"پیچھے مڑ کر کیا دیکھتا، میں تو دیکھ ہی نہیں رہا تھا، بس وہی تھی اور کچھ بھی نہیں تھا، اور وہ کہتی تھی انتظار ہلکی آنچ پر پکتی ہنڈیا ہے جس کا اپنا ہی ذائقہ ہے، لیکن"

"لیکن کیا" ب دلچسپی سے پوچھتا ہے

"کئی شامیں صبحوں میں اور کئی صبحیں شاموں میں بدل گئی ہیں، لیکن تصویر مکمل نہیں ہو پائی"،

"کون سی تصویر؟" ب حیرانی سے پوچھتا ہے'

"بس وہ تصویر جس میں اس کا پورا چہرہ بنانا چاہتا تھا، میں چپکے چپکے اس کی تصویر بنا رہا تھا، معلوم نہیں اُسے کیسے معلوم ہوگیا، بس اُس شام وہ آئی تو چُپ چپ تھی، میں نے بہت پوچھا کچھ تو کہو، پہلے تو بولی ہی نہیں، پھر کہنے لگی ـــــ تصویر کب مکمل ہوگی؟ میں تو حیران رہ گیا"

"تمہیں کس نے بتایا؟" اس کے ہونٹوں پر اُداس مسکراہٹ کی لے جاگی۔ ہم دونوں چُپ ہوگئے۔ میں خاموشی سے موٹر سائیکل چلاتا رہا، دفعتہً مجھے احساس ہوا کہ وہ پیچھے نہیں ہے، میں نے مُڑ کر دیکھا ـــــ وہ واقعی نہیں تھی"

ب کچھ دیر چُپ رہا پھر بولا ـــــ "لیکن وہ چلتے موٹر سائیکل سے کیسے اُتر سکتی ہے؟"

"یہی معمہ تو حل نہیں ہوتا"

"تم نے ضرور کہیں موٹر سائیکل روکی ہوگی"

"نہیں ـــــ مجھے ایک ایک لمحہ یاد ہے ـــــ میری گرفت میں ہے، بس وہ پیچھے بیٹھے بیٹھے غائب ہوگئی"

فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہوئی وہ پھر چپکے چپکے مسکراتی ہے اور چادر میں چھپائے سورج کے چہرے پر انگلیاں پھیرتی ہے'

"پھر کبھی نہیں ملی" ب افسوس سے پوچھتا ہے

"میں، وہ اور دوسرے سب اُسے تلاش کر رہے ہیں، میرا موٹر سائیکل ابھی تک اسی سڑک کے کنارے کھڑا ہے، اب تو اس پر اتنی دُھول پڑ گئی ہے کہ پہچانا نہیں جاتا اس کا نمبر بھی اب ختم ہو چکا ہے، اب تو نئے نمبر آگئے ہیں"

"تو تم موٹر سائیکل بھی لینے نہیں گئے"

"نہیں ـــــ میں تو اس کی تلاش میں نکلا ہوں، اسے ساتھ لے کر ہی جاؤں گا"

چند لمحے گہری خاموشی،

پھر ا سر اُٹھا کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہوئی اُسے دیکھتا ہے، مسکراتا ہے اور ب سے کہتا ہے ——— "مدتوں بعد آخر وہ مل ہی گئی نا"

"کہاں ——— کب؟" ب بیتابی سے پوچھتا ہے۔

ا ایک لمحہ کے لئے چپ رہتا ہے، پھر عجب پُراسرار نگاہوں سے ب کو دیکھتے ہوئے کہتا ہے ——— "یہ جو فرنٹ سیٹ پر ہے نا، سورج کو گود میں چھپائے، یہ وہی ہے۔ بالکل وہی"

ب پہلے اُسے پھر فرنٹ سیٹ کو، پھر اُسے دیکھتا ہے، کچھ دیر خاموش رہتا ہے، پھر کہتا ہے ——— "لیکن فرنٹ سیٹ پر تو کوئی نہیں"

ا حیرت سے ب کو دیکھتا ہے ——— "تمہاری نظر کمزور تو نہیں"

ب کو غصہ آجاتا ہے ——— "میری نظر تو ٹھیک ہے، تمہارے ساتھ ضرور کچھ گڑبڑ ہے، فرنٹ سیٹ تو شروع ہی سے خالی ہے"

"کون کہتا ہے خالی ہے" ا زور سے کہتا ہے

"میں کہتا ہوں" ب بھی چیخ کر جواب دیتا ہے

ڈرائیور اور دوسری سواریاں ان کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں

"کیا بات ہے؟"

"کیا بات ہے؟"

ا روہانسا ہو جاتا ہے ——— "اتنے عرصہ بعد تو وہ مجھے ملی ہے اور اب یہ کہتا ہے کہ فرنٹ سیٹ پر کوئی نہیں"

دائیں طرف بیٹھا ہوا ایک شخص اُس کی تائید کرتا ہے ——— "وہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہوئی ہے"

پیچھے سے ایک شخص کہتا ہے ــــــ "یہ غلط ہے فرنٹ سیٹ خالی ہے"
و ڈرائیور سے پوچھتا ــــــ "کیوں جناب فرنٹ سیٹ خالی ہے"؟
ڈرائیور سر ہلاتا ہے ــــــ "بالکل خالی ہے ــــــ شروع ہی سے خالی ہے"
کنڈیکٹر فوراً ٹوکتا ہے ــــــ "یہ غلط کہہ رہا ہے ــــــ" فرنٹ سیٹ خالی نہیں ہے وہ شروع ہی سے وہاں بیٹھی ہوئی ہے"

آدھی سواریاں ایک طرف اور آدھی دوسری طرف ــــــ آدھے کہتے ہیں فرنٹ سیٹ خالی ہے، باقی آدھے کہتے ہیں، فرنٹ سیٹ خالی نہیں وہ وہاں بیٹھی ہوئی ہے۔
ڈرائیور نے عین ہائی وے کے درمیان ویگن کھڑی کردی ہے۔ سب نیچے اتر آئے ہیں اور چیخ چیخ کر ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں دونوں طرف ٹریفک رُک جاتی ہے اور ان کے گرد ایک ہجوم جمع ہو جاتا ہے،
کچھ ادھر ہو جاتے ہیں اور کچھ اُدھر،
کچھ و کے ساتھ ہیں، کچھ ب کے ساتھ،
اب شام تاریکی کی گھنی قبر میں دفن ہو گئی ہے
سارے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے ہیں اور چیخ چیخ کر ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن کوئی دوسرے کی بات نہیں سنتا،
اور ان سب سے بے پرواہ وہ فرنٹ سیٹ پر سورج کو چادر میں چھپائے مسکرائے چلی جاتی ہے؛

(۳)

میں، وہ اور دوسرے سب تصویر کی ناتکمیلی کا نوحہ ہیں
ایسا نوحہ کہ جس کا نہ کوئی عنوان ہے، نہ موضوع

وہ اپنے آپ پر منکشف ہونا چاہتا ہے،

لیکن جوں جوں اپنا آپ کھولتا ہے، دُھند بڑھتی جاتی ہے، اور اسے اپنا آپ نظر آنے کی بجائے چہروں کے ایسے ایسے چہرے نظر آنے لگتے ہیں، جنہیں کبھی دیکھا، نہ سُنا۔

اجنبی دُنیا، ایک نیم تاریک گلی، جو اس کے وجود کی بالکنی سے شروع ہوتی ہے، اور پھیلتے پھیلتے اس اونچے ٹیلے کو جا چھوتی ہے، جو شہر سے باہر زمین میں دور تک پاؤں پھیلائے خرّاٹے لے رہا ہے۔ اس ٹیلہ پر روز میلہ لگتا ہے، صبح ہوتے ہی لوگ ٹولیوں میں گاتے ناچتے وہاں آتے ہیں اور سارا دن ڈھول کی دھمال پر رقص کرتے ہیں، شام ہوتے ہی رقص رُک جاتا ہے اور اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے سارے لوگ ٹیلہ کی بلندی سے نیچے چھلانگ لگا دیتے ہیں، میلہ آہستہ آہستہ خاموشی اور اندھیرے کے سمندر میں ڈوب جاتا ہے،

اس کے وجود کی بالکنی سے ٹیلہ تک پھیلی نیم تاریک گلی سائیں سائیں کرنے لگتی ہے،
وہ نیچے اُترتا ہے ______ گلی سے ہوتا ہوا ٹیلہ پر آتا ہے،

اپنے آپ پر منکشف ہونا ایک عجیب لمحہ ہے،

اور شاید ایک عجیب لذّت،

وہ اپنے ہونٹ چاٹتا ہے، میلہ کی دکانیں بھری پڑی ہیں

لیکن ایک اُداسی ــــ سنسناتی اُداسی،

ویرانی ــــ ویرانی سی ویرانی،

اجتماعی خودکشی

عورتیں اپنے اپنے مرد کی لاش پر بین کرتی ہیں،

میں اپنے آپ کو دیکھنا چاہتا ہوں ــــ اپنے آپ پر منکشف ہونا چاہتا ہوں،

انفرادی آزادی

اجتماعی خودکشی اور انفرادی آزادی،

وہ آہستگی سے نیم تاریک گلی میں رینگ آتا ہے

کسی کی چاپ ہولے ہولے اس کے کانوں پر دستک دیتی ہے، نیم تاریک گلی میں چلنا کتنا خواب آگیں ہے،

لیکن اس لمحہ ایک ڈراؤنا خواب، ایک المناک بین دبے پاؤں اس کے پیچھے چلا آتا ہے،

مڑ کر دیکھوں،

پتھر ہو جانے کا ڈر ــــ

ڈر، خوف ــــ بھری جنگ میں اکیلے رہ جانے کا خوف،

تلواروں کی گونج اور رتھوں کے شور میں وہ سر اٹھاتا ہے ــــ "اگر آپ اس سمے اپنے درشن دیویں تو میں امر ہو جاؤں گا۔"

مسکراہٹ اپنے چہرے سے نقاب سرکاتی ہے،

کشف ایک آئینہ ہے

ہیر پر ٹنگا سر جنگ کے خاتمہ تک کھلی آنکھ سے ایک ایک لمحہ کو گزرتے دیکھے گا

تو میں اپنا دُھنش اٹھاتا ہوں،

مسکراہٹ گھنی ہو جاتی ہے

زندگی تو نیم تاریک گلی ہے ——

لیکن اس نیم تاریک گلی میں وہ میرے پیچھے کیوں آتا ہے اور میری آنکھوں کے خواب کیوں چُرا کر لے جاتا ہے

خواب خواہشوں کی نازک کلائیوں میں پہنی چوڑیوں کی کرچیاں ہیں

ٹوٹی کرچیاں —— خواب ہی خواب، ٹیلہ کے اس طرف بھی خواب، اس طرف بھی خواب،

اور وہ آواز جسے سُن کر سارے ایک ایک کر کے نیچے چھلانگ لگا دیتے ہیں۔

یا اخی —— یا اخی

لیکن وہ تو ابھی اس نیم تاریک گلی ہی میں رینگ رہا ہے، جہاں کوئی دبے پاؤں اس کے پیچھے آتا ہے،

کون ہے —— ؟

میلہ میں اس کی آواز گونجتی ہے —— یہاں کون ہے —— ؟

کوئی نہیں سنتا، لوگ ڈھول کی تھاپ پر ناچتے گاتے، دھمالیں ڈالتے آتے ہیں، عجب رنگا رنگی ہے۔

آوازوں کی آبشاریں، چہروں کے قہقہے، ذائقوں کی بھنبھناہٹیں،

یا اخی ——

یا اخی —— یا اخی

ناچتے گاتے جسموں میں جھٹکا لگتا ہے، سر اٹھا کر آواز کی سمت کا تعین کرتے ہیں اور لبیک لبیک کہتے دوڑ پڑتے ہیں، ایک ایک کرکے ــــــ ایک ایک کرکے گہرائیوں کے فاصلے میں اُترنے لگتے ہیں،

میلہ سُنسان ہو جاتا ہے

تو آج کا دن بھی تمام ہوا ــــــ کھیل ختم ہوا

لیکن کھیل کبھی ختم نہیں ہوتا،

کل کھیل پھر شروع ہوگا، اسی سج دھج کے ساتھ

"زندگی کیا ہے؟"

ہونٹوں پر ایک پُراسرار مسکراہٹ جنم لیتی ہے ــــــ "زندگی ایک چُپ آواز ہے"

"چُپ آواز"

"سمجھ میں آجائے تو آواز، نہ سمجھ آئے تو گہری چُپ"

میلہ میں جو اس آواز کو سُن لیں وہ لبیک کہتے ہیں، جو نہ سُن پائیں وہ نیم تاریک گلی میں سے ہوتے ہوئے واپس اپنے آپ میں آجاتے ہیں،

بالکنی کا دروازہ تو ہمیشہ کھُلا رہتا ہے،

دونوں ہاتھ بلند ہوتے ہیں ــــــ "لو ماتا جنگ تو تمام ہوئی اب ہم جاتے ہیں"

بنتی کرتے ہاتھ عرض کرتے ہیں ــــــ "اب آپ کے درشن کب ہوں گے؟"

لمحہ بھر توقف ہوتا ہے ــــــ "جب تم دُکھ میں ہوگی کہ میں دکھ کے ہر لمحہ میں آنے کا پابند ہوں"

بنتی کرتے ہاتھ دعا کرتے ہیں ــــــ "مجھے ہمیشہ دُکھ میں رکھنا"

اور دُکھ میری پہچان ہے

وہ نیم تاریک گلی میں اُترتا ہے، آہستہ آہستہ ٹیلہ پر آتا ہے، سُنسانی ڈبے پاؤں

چاروں طرف بکھر رہی ہے

تیر پر ٹنگا سر آنکھیں جھپکاتا ہے،

" تو یہ سر ابھی تک اسی طرح ٹنگا ہے، لیکن جنگ تو کبھی کی تمام ہوئی اور جانے والے جا بھی چکے"

آگے بڑھ کر سر کو تیر سے اٹھانا چاہتا ہے مگر رُک جاتا ہے

مجھے تو ابھی اپنا کشف، ہی نہیں ہوا،

اٹھے ہاتھ نیچے گر جاتے ہیں، خاموشی سے واپس پلٹتا ہے اور بوجھل قدموں سے نیم تاریک گلی طے کر کے اپنے جسم کی چار دیواری میں آ گرتا ہے

اپنے آپ پر منکشف ہونے کی تمنا ــــــ بس ایک تمنّا ہی ہے

برف کی سل پر وہ سارے دائرے میں بیٹھے ہوئے ایک دوسرے کی آنکھ جھپکنے کے منتظر ہیں، وہ بھی اپنی باری کا انتظار کر رہا ہے کہ یا تو آنکھ جھپکا کر اپنے آپ کو دوسروں سے چیر پھڑوالے یا پھر کسی کی آنکھ جھپکتے ہی اسے چیر پھاڑ ڈالے۔

ایک لمحہ کی فرصت ہے

اور اس لمحہ بھر کی فرصت میں اگر وہ آگے بڑھ کر، ہمت کر کے درخت کی شاخ پر جو کھاتے پرندے کے جوڑے میں سے تیر کو کھینچ کر نکال بھی لے تو کیا کہ وہ تو عین لذّت کی گھڑی میں ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہونے پر مجبور کر دیئے گئے تھے،

تو پھر اپنے آپ پر منکشف ہونا بھی کیا، اور نہ ہونا بھی کیا ؟

بے راستوں کا
ذائقہ

موت سب سے پہلے خواب بن کر اس کی آنکھوں میں اُتری اور صبح آنکھ کھلنے سے پہلے اپنا بدن چُرا کر نکل گئی۔

اُس دن وہ بھاگم بھاگ بیوی کے سکول پہنچا، وہ ورانڈے میں دوسری استانیوں کے ساتھ بیٹھی دُھوپ سینک رہی تھی، اُسے یوں پریشان دیکھ کر گھبرا گئی ——"کیا بات ہے؟"

"مَیں مر گیا ہوں۔" اُس نے پھُولی ہوئی سانسوں میں کہا۔

بیوی کے مُنہ سے چیخ نکلی، لیکن اگلے ہی لمحہ غصّہ کھٹ کھٹ کرتا، اُس کے منہ پر پھیل گیا—"شرم نہیں آتی ایسا مذاق کرتے ہوئے۔"

"یہ مذاق نہیں۔" وہ دونوں ہاتھ ملتے ہوئے بولا ——"مَیں سچ مُچ مر گیا ہوں۔"

"کیا بکواس ہے؟" بیوی جھنجلا گئی۔

دوسری استانیاں بھی اُن کی طرف متوجہ ہو گئیں، ایک بولی—"بھائی صاحب آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟"

"سچ کہہ رہا ہوں، مَیں واقعی مر گیا ہوں۔"

پھر بیوی کی طرف مُنہ کر کے کہنے لگا۔"چلو جلدی کرو ابھی بہت سے لوگوں کو اطلاع

دینا ہے۔ کفن دفن کا بندوبست بھی کرنا ہے۔"

بیوی نے غصّے سے اس کی طرف دیکھا، کچھ کہنا چاہا، پھر چُپ ہو گئی اور خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑی۔

سڑک پہ پہنچ کر اُس نے کہا ـــــ "میرا خیال ہے رتہ والا قبرستان بہتر رہے گا، بڑے گھنے درخت ہیں وہاں۔"

بیوی نے تنک کر اُس کی طرف دیکھا ـــــ "تمہیں ہوا کیا ہے؟"

"ہونا کیا ہے، بس میں مر گیا ہوں۔"

"پَر کیسے؟"

وہ سوچ میں پڑ گیا ـــــ "کیسے؟"

وہ مسلسل اُسے گھورے جا رہی تھی۔

"کیسے؟" اُس نے خود سے پوچھا، سوچا، ذہن پر زور دیا مگر اسے کوئی جواب نہ سوجھا۔

بس اتنا یاد آیا کہ موت خواب بن کر اُس کی آنکھوں میں اُتری تھی، اُس کے بعد ـــــ اُس کے بعد کچھ یاد نہ تھا۔

وہ سوچتا رہا، سوچتا رہا، پھر بولا ـــــ "چلو چھوڑو ـــــ آؤ کہیں بیٹھ کے چائے پئیں۔"

چائے کا آرڈر دے کر بیرا گیا ہی تھا کہ منیجر ان کی میز پر آیا۔

"کون ہو تم؟"

"مَیں ـــــ مَیں ہوں۔"

"اور یہ عورت؟"

"میری بیوی ہے"

"ثبوت؟"

"بس یہ میری بیوی ہے۔"

"نکاح نامہ ہے تمہارے پاس؟"

اُس نے مڑ کر بیوی کو دیکھا اور سوچا اس عورت سے جو اُس کے دو بچوں کی ماں ہے اُس کے تعلقات کیا ہیں؟

وہ مسلسل اُسے دیکھتا رہا،

وہ بولی ــــ "کیا دیکھ رہے ہو؟

"کچھ نہیں ــــ" وہ بولا ــــ "پھر کب ملو گی؟"

"کیا؟" وہ چیخ کر بولی ــــ "تم مجھے گرل فرینڈ سمجھ رہے ہو؟"

اور اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر پیر پٹختی باہر نکل گئی۔

دوسری رات موت جس نے اُس کی آنکھوں کا دریچہ کھُلا دیکھ لیا تھا، چپکے سے آئی اور آنکھوں کے راستے جسم میں اُتر گئی۔ ساری رات وہ اس کے جسم کے اندر گھومتی پھری اور صبح ہوتے ہوتے چپکے سے نکل گئی۔

دن چڑھے وہ قبرستان گیا اور گورکن سے کہنے لگا ــــ "میری قبر کھود دو"

گورکن نے مشکوک نظروں سے اُسے دیکھا۔

قبر ذرا لمبی چوڑی ہو، سلیں بھی صاف ستھری ــــ اور ہاں جگہ اچھی ہو، کسی گھنے درخت کے پاس"

گورکن نے انگلی سے سر کھجایا، اُسے گھورا اور جواب دیئے بغیر دوسری طرف چلا گیا۔

اگلی رات موت دستک دے کر آئی، اُس نے اُس کے جسم کے کواڑوں کو زور زور سے کھٹکھٹایا۔

وہ سہم گیا اور ڈری آواز میں بولا ــــ "کون؟"

"میں" موت نے سرگوشی کی ــــ "دروازہ کھولو"

"میں دروازہ نہیں کھولوں گا" وہ کپکپاتی آواز میں بولا ــــ "میں تمہیں اندر نہیں آنے دوں گا"

موت کھلکھلا کر ہنسی —— "میں تو تمہارے اندر ہی ہوں۔"

"تو پھر یہ باہر سے دروازہ کون کھٹکھٹا رہا ہے؟"

"تم خود"

"میں —" اس نے بوکھلا کر اپنے سارے وجود کو ٹٹولا، وہ کھلکھلا کر ہنسی اور ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی،

"تو میں اپنے جسم سے باہر ہوں اور موت اندر ہے۔"

وہ بولی —— "آؤ مکالمہ کریں۔"

"کس سے" وہ بڑبڑایا —— "میں تو اپنے اندر ہی نہیں۔"

اگلی رات اس نے پھر دستک دی۔

اس نے بھی آواز میں پوچھا —— "کون؟"

"آؤ مکالمہ کریں" وہ کھلکھلائی

"پہلے یہ بتاؤ تم کہاں ہو۔ میرے اندر یا باہر"

"میں تمہارے اندر بھی ہوں اور باہر بھی ہوں"

"تو میں کہاں ہوں — میں تو نہ اپنے اندر ہوں نہ باہر"

"آؤ مکالمہ کریں" وہ کھلکھلائی،

وہ یہ سن کر اور دبک گیا، وہ ساری رات دستکیں دیتی، اس کا نام لے لے پکارتی رہی،

صبح وہ ناشتہ کئے بغیر ہی قبرستان پہنچا۔

گورکن اپنی کوٹھڑی میں چائے پی رہا تھا۔

"میری قبر کھد گئی؟"

گورکن نے مشکوک نظروں سے اس کو دیکھا

"تو ٹھیک ہے — میں خود ہی کھود لوں گا۔"

اُس نے کدال اٹھائی، قبرستان کا چکر لگایا اور ایک گھنے درخت کے نیچے قبر کھودنا شروع کی، کچھ ہی دیر میں وہ پسینہ پسینہ ہو گیا، اُس نے قمیض اُتار پھینکی، پھر کچھ دیر بعد بنیان، پھر پتلون ـــــ بس انڈر ویئر رہ گیا۔

سورج آہستہ آہستہ چلتا اس کے عین سر پر آن کھڑا ہوا اور جھک کر قبر میں جھانکنے لگا۔ قبر اس کے سر سے اونچی ہو گئی۔ اس نے مٹی نکال کر اسے اچھی طرح صاف کیا، ایک ایک کر کے سلیں اکٹھی کیں، پانی کی بالٹی ـــــ گارا بنایا اور قبر میں اُتر کر چت لیٹ گیا۔

اب صورت یہ ہے کہ وہ قبر میں چت لیٹا ہوا ہے، قبر کے گرداگرد اس کی بیوی بچے، ماں، بہن بھائی، دوست، رشتہ دار گھیرا ڈالے کھڑے ہیں اور اسے قبر سے باہر نکلنے کے لئے کہہ رہے ہیں۔

وہ اندر سے جواب دیتا ہے ـــــ "میرا مُردہ خراب نہ کرو، جلدی سلیں رکھ کر مٹی ڈالو۔"

بیوی گڑگڑاتی ہے ـــــ "خدا کے لئے باہر آجاؤ، میرا نہیں تو ان چھوٹے چھوٹے بچوں ہی کا خیال کرو۔"

وہ نفی میں سر ہلاتا ہے

ماں کہتی ہے ـــــ "بیٹا اب نکل آؤ، میرے بڑھاپے ہی کا کچھ خیال کرو۔"

وہ نفی میں سر ہلاتا ہے ـــــ "میرا مُردہ خراب نہ کرو۔"

وہ سب ایک آواز ہو کر کہتے ہیں ـــــ "اب نکل آؤ۔"

وہ کہتا ہے ـــــ "اچھا یہ بتاؤ میں کون ہوں؟"

وہ کہتے ہیں ـــــ "تم الف ہو"

وہ کھلکھلا کر ہنستا ہے ـــــ "میں الف نہیں ہوں۔ میں نہ اپنے اندر ہوں نہ باہر اور وہ میرے اندر بھی ہے اور باہر بھی۔"

وہ کہتے ہیں ـــــ "اچھا تو پھر بتاؤ تم اگر الف نہیں تو کون ہو؟"

وہ شانے اچکاتا ہے — "یہی تو مجھے معلوم نہیں — کہ میں نہ اپنے اندر ہوں نہ باہر — اور وہ میرے اندر بھی ہے اور باہر بھی۔"

دائرہ در دائرہ وہ سب کے سب اسے اپنے بتائے ہوئے نام، شخصیت اور ماحول کے چوکھٹے میں زبردستی فِٹ کرنے کی سر توڑ کوشش کر رہے ہیں، مگر وہ بار بار، پہلو بدل بدل کر اس چوکھٹے سے پھسل جاتا ہے،

اور ان سب کے اِرد گرد — وہ جو قبر کے گرداگرد گھیرا ڈالے اُسے باہر نکل آنے اور اسے ان کی پسند کا نام، شخصیت اور ماحول اختیار کر کے ان کی مرضی بن جانے کو کہہ رہے ہیں اور وہ جو قبر کے اندر چِت لیٹا دوسروں کی مرضی کے مطابق بن جانے اور باہر نکلنے سے انکاری ہے۔ ان سب کے اِرد گرد موجود اور ناموجود کی سُرمئی دُھند میں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے وقت اور موسم اس سارے تماشا کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہے ہیں۔

بس ہنستے ہی چلے جاتے ہیں،

مَیں اپنی تاریخِ پیدائش بھول گیا ہوں اور اب تذبذب کی سیڑھیوں پر کھڑا اپنی عمر کا تعین کر رہا ہوں ۔ کبھی لگتا ہے کہ زندگی کے مٹیالے کاغذ پر بنا ہزاروں سال پرانا نقش ہوں ، تاریخ کے پھڑپھڑاتے صفحوں کے ساتھ سانس لینے کی کوشش ، حال کی چار دیواری پھلانگ کر ماضی کے دُھندلے موسموں میں دیر تک مسلسل بھیگنے کی خواہش ، مگر یہ تو تذبذب کی سیڑھی ہے اور میں اپنی عمر کا تعین کرنے کی کوشش کر رہا ہوں ، کبھی لگتا ہے ابھی ابھی بس ایک ہی لمحہ پہلے پیدا ہوا ہوں ، چُوسنی منہ میں ہے ، چُوسنی منہ میں نہیں ہے ۔ وہی سیڑھی ہے اور مَیں ہوں اور عمر کا تعین کرنے کی کوشش ، تو میری تاریخِ پیدائش گُم ہو گئی ہے ۔ شاید کوئی تاریخ ہو ہی نہ ، تو مَیں پیدا کب ہوا ؟ شاید ہوا ہی نہ ہوں ۔ مگر مَیں موجود ہوں ، اپنے جسم کو چھُوتا ہوں ، لمبے لمبے سانس لے کے ہونے کا احساس کرتا ہوں ۔

تو میں ہوں بس میری عمر معلوم نہیں ، عمر دس ہزار سال بھی ہو سکتی ہے ، پانچ ہزار بھی ایک ہزار بھی —— اور ایک لمحہ بھی

تاریخ کھولتا ہوں ، صفحے پھٹے ہوئے ہیں شاید مَیں نے خود ہی انہیں پھاڑ دیا ہے ۔ تو میری عمر صرف ایک ہزار سال ہے ۔ لیکن فوراً ہی احساس ہوتا ہے کہ ہزار سال ہونے کے

باوجود میری جڑیں زمین میں نہیں ہیں، تو میری جڑیں کہاں ہیں۔

گھبراکر سارے وجود کو ٹٹولتا ہوں۔

حیرت ناک انکشاف ——— میری جڑیں، ہی نہیں۔

تو زندہ کیسے ہوں۔

معلوم نہیں زندہ ہوں بھی کہ نہیں؟

پھر سارے وجود کو ٹٹولتا ہوں ——— ایک ایک پور کو چھوتا ہوں، درد، احساس حرارت، سب موجود ہیں۔ مگر جڑیں نہیں، تو جڑیں کہاں ہیں۔

شاخیں، شاخوں پر پتّے، پتّوں پر چہچہاتے پرندے۔

کاغذ پر بنے نقش۔

شاخیں، شاخیں نہیں۔

پتّے، پتّے نہیں۔

پرندے، پرندے نہیں۔

سب کچھ ان جیسا ہے، شاخیں شاخوں جیسی، پتّے پتّوں جیسے، پرندے پرندوں جیسے، چہکار، اگر یہ چہکار ہے تو چہکار جیسی اور میں خود۔

ہزار سالہ وجود پر انگلیاں پھیرتا ہوں۔

بھربھری مٹّی، تڑخی ہوئی زمین، لکیریں ہی لکیریں، مسخ عبارتوں کے پھٹے اوراق، بوسیدہ عمارت جو نہ تو موجود ہے اور نہ ہی ناموجود۔

ذرا زور لگاتا ہوں ساری عمارت کھسک کر دوسری طرف چلی جاتی ہے۔

تاریخ کے شروع کے تو سارے ورق پھٹے ہوئے ہیں، میں نے خود ہی پھاڑ دیئے ہیں۔ ان پھٹے اوراق میں ہزاروں سال سسک رہے ہیں۔ دھندلاہٹوں میں بیل گاڑیوں کے قافلے نظر آتے ہیں۔

ہریالے میدانوں کو روندتے سبزوں کو چاٹتے قافلے مجھے دھکیل دھکیل کر جنگلوں میں پھینک دیتے ہیں۔

میٹھے پانیوں کی لذت، لہلہاتے کھیتوں کے ذائقے بانہیں سمیٹ لیتے ہیں۔

گھنے جنگل میں اکیلے ہونے کا دکھ۔

مگر میں نے تو یہ صفحات پہلے ہی پھاڑ ڈالے ہیں، رشتے ٹوٹ گئے ہیں تو میرے پاس بے معنی چپ لفظوں کا ڈھیر رہ گیا ہے جو نہ بولتا ہے، نہ دیکھتا ہے۔

لفظوں کی زبانیں کٹی ہوئی ہیں۔

میں نے خود ہی کاٹی ہیں

میں اپنی عمر ہزار سال سے آگے نہیں لے جانا چاہتا، اس سے آگے مجھے احساسِ کمتری ہونے لگتا ہے۔

تو میں ہزار سال کا ہوں

اس سے پہلے میری کوئی تاریخ ہے نہ جغرافیہ نہ وجود کی کوئی پہچان۔

تاریخ کے صفحات میں دیمک، جغرافیہ پر بھاری بُوٹ، چیونٹیاں رینگ رینگ کر دانہ دانہ اکٹھا کرتی ہیں۔

تو دراصل میں ایک چیونٹی ہوں۔

چیونٹیوں کی لمبی قطار میں چاول کا آدھا دانہ اٹھائے اپنے سوراخ کی طرف دوڑا جاتا ہوں۔

چاول کا آدھا دانہ ہزار سالہ زندگی کا انعام۔

بوسیدہ عمارت کی کھڑکی سے سر نکال کر چیختا ہوں ــــــ "میری عمر ہزار سال ہے۔"

چیونٹیاں سر ہلاتی، کورس میں گاتی ہیں ــــــ "ہزار سال۔ ہزار سال"

درخت کی شاخ پر بیٹھا اُلّو دیدے نچاتا ہے ــــ "میری عمر بھی ہزار سال ہے"

"تو کیا تم نے بھی اپنی پُرانی تاریخ پھاڑ ڈالی ہے؟" میں اس سے پوچھتا ہوں۔

وہ ہنستا ہے ——— "میں نئی تاریخ بناؤں گا، بغیر جغرافیے کے"

جغرافیے کے بغیر تاریخ بنانے کے جنون میں ہی تو میں نے سارے صفحے پھاڑ ڈالے ہیں۔

آتے جاتے موسموں کی پھوار۔

اُلّو۔ عمارت، میں سب منجمد ہو جاتے ہیں۔

بوسیدگی کا ایک ڈھیر، جس کی کوئی تاریخ، کوئی جغرافیہ نہیں۔

تو میری عمر صرف ایک ہزار سال ہے اور میری جڑیں نہیں۔

میں اپنے وجود کو اٹھا کر لکیر کے دوسری طرف لے جاتا ہوں۔

گملے کو جہاں مرضی لے جائیں۔

تو میں جیسا اس طرف تھا ویسا ہی اُس طرف بھی ہوں۔

زمین کا پیار، مزاج، پانیوں کا ذائقہ اور ہواؤں کی تبدیلیوں سے مجھے کچھ نہیں ہوتا۔

میں نہ بڑھتا ہوں، نہ پھولتا پھلتا ہوں۔

دس ہزار سال کی تاریخ کو میں نے خود پھاڑ دیا ہے۔ رہ گئے ہزار سال تو انہیں دیمک چاٹ گئی ہے۔ دیمک کے چاٹتے ہوئے مٹیالے پن میں ہاتھیوں کا جلوس، نقّار خانوں کا شور، تلواروں کی گونج ——— بھائی بھائی کو قتل کرتا اور باپ کو قید کرتا ہے۔

مار دھاڑ کے ان ہزار سالوں کے تقدّس کے لئے میں نے پچھلے دس ہزار سال پھاڑ دیئے ہیں اور ان ہزار سالوں کو بھی دیمک چاٹ گئی ہے۔

میری عمر ایک لمحہ ہے

میں ابھی ابھی پیدا ہوا ہوں اور ابھی ابھی مر گیا ہوں۔

شاید میں پیدا بعد میں ہوتا ہوں، مر پہلے جاتا ہوں۔

شاید میں ابھی پیدا ہی نہ ہوا ہوں۔

تو پھر یہ کون ہے ـــــ یہ وجود ـــــ میں اپنے بدن پر ہاتھ پھیرتا ہوں۔

"کیا یہ وجود ہے؟" میں خود سے سوال کرتا ہوں۔

اُلّو شاخ سے اُڑ کر میرے کاندھے پر آن بیٹھتا ہے۔ میری بات سُن کر ہنستا ہے۔

"یہ وہم اور وجود کا ملغوبہ ہے۔"

تو میں موجود ہی نہیں پھر تاریخ پیدائش بھولنے کا مطلب؟

میری ساری عمر میرا اپنا واہمہ ہے

ہزار سال کا ہونا بھی میرا اپنا تصور ہے ـــــ ایک لمحہ کا ہونا بھی میرا اپنا تصور ـــــ

تاریخ میری کو تو دیمک نے چاٹ لیا ہے۔

ہزار سال بھی ختم ہوئے۔

تو بات اس لمحہ میں سمٹ گئی ہے

میں ابھی ابھی پیدا ہوا ہوں۔

میں بلک بلک کر رونے لگتا ہوں۔

ماں دوڑی دوڑی پنگھوڑے کے پاس آتی ہے اور جھک کر میرے گالوں کو تھپتھپاتی ہے۔

"میرا بیبو بھوک لگی ہے۔"

میں کہتا ہوں "میری چوسنی لاؤ ـــــ فیڈر بھی لاؤ۔"

ماں چیخ مار کر پرے ہٹ جاتی ہے۔

"کیا ہوا ـــــ کیا ہوا؟" سارے لوگ ہمارے گرد اکٹھے ہو جاتے ہیں۔

"یہ ـــــ یہ" ماں خوف زدہ ہو کر پنگھوڑے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

"یہ ـــــ یہ بول رہا ہے۔"

"تو اس کا مطلب یہ پیغمبر ہے"

وہ سارے عقیدے اور احترام سے جھک جاتے ہیں۔

"یہ پیغمبر ہے ___ اور اس سے پہلے کہ ہم پر عذاب آئے آؤ اس کے ہاتھ پر بیعت کریں"

وہ آگے بڑھ کر میرا دایاں ہاتھ اٹھاتے ہیں

میرا دایاں ہاتھ نہیں ہے۔

وہ میرا بایاں ہاتھ اٹھاتے ہیں

میرا بایاں ہاتھ بھی نہیں ہے۔

یہ تو لُنجا ہے۔

میں کچھ کہنے کی کوشش کرتا ہوں مگر غاں آں ___ غاں آں کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔

گُونگا بھی۔

گُونگا اور لُنجا۔

وہ سب دھاڑیں مار مار کر روتے ہیں۔

اور ان سب کے درمیان پنگھوڑے میں لیٹا میں اپنی تاریخ پیدائش یاد کر رہا ہوں اور یہ بھی کہ میں کب سے گُونگا اور لُنجا ہوں۔

دس ہزار، پانچ ہزار، ایک ہزار سال سے ___ یا ابھی ابھی اسی لمحہ سے۔

ہریالی بارش مانگتی ہے، اور بادل خوب گھر گھر آتے ہیں لیکن بارش نہیں ہوتی،
پیاسا شہر ہانپ ہانپ کر اپنے ہی آپ سے باہر اُبل پڑا ہے —— ایک پھیلاؤ ہے
کہ سمٹے نہیں سمٹتا، لیکن ایک دائرہ ہے گرداگرد جو تنگ ہی ہوتا چلا جاتا ہے ——

(۲)

کلاس میں لیکچر دیتے ہوئے اس نے لڑکوں پر ایک نظر ڈالی اور باہر دیکھنے لگا۔
گرمی —— شدید گرمی
لڑکوں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا
"ہاں گرمی، اور بارش نہیں ہوتی، ہریالی تو بارش مانگتی ہے"
اُس نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا —— "سارے گلاب سوکھ گئے ہیں
بنجر پن ایک ایک چہرے پر کنڈل مارے بیٹھا ہے"
شگفتہ چہرے شہر کا حسن ہیں اور یہاں تو سارا شہر ہی پیاس سے ہانپ رہا ہے،

بارش کب ہوگی ؟

بادلوں کے ٹکڑے آسمان کے طشت میں ایک دوسرے سے آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں
روز کی طرح آج بھی یہ ایک دوسرے کو پکڑتے، چھپتے چھپاتے شہر کی باہوں کے
دائرے سے نکل جائیں گے اور حبس زدہ چہرے والی گرم رات ان پر ٹوٹ پڑے گی۔

رات کا تصور آتے ہی اسے جھرجھری آگئی

حبس زدہ گرم رات نے توان سے پیمان کے سارے زاویے چھین لئے ہیں اور ایک
حبس زدہ بے غیرت چپچپاہٹ ان کے چہروں پر چپکا دی ہے۔

وہ باہر نکل آیا

"کہاں جارہے ہو؟" کسی نے پوچھا

"ہریالی تلاش کرنے"

"ہریالی"

اُس نے کندھے اچکائے، موٹر سائیکل سٹارٹ کی اور سڑک پر نکل آیا،

"کہاں جاؤں ؟"

بادلوں کے سُرمئی ٹکڑے ایک ایک کر کے آسمان سے رخصت ہو رہے تھے

وہ شہر سے باہر نکل آیا ـــــ فضا میں دفعتہً سیاہی سی گھُلنے لگی۔ بادلوں کے بھاگے
ہوئے ٹکڑے پھر اکٹھے ہونے لگے تھے،

شہر اب پیچھے رہ گیا تھا ـــــ گھنے درختوں کے خشک چہرے اس کے دونوں طرف
پھیلے ہوئے تھے

بارش ـــــ بارش شاید اب کبھی نہ ہو ـــــ اُس نے سوچا ـــــ اور یہ سارے
چہرے ایک ایک کر کے مرجھا جائیں گے ـــــ سارا شہر بے آبرو ہو جائے گا
درخت ـــــ شہر کا لباس اور جب یہ لباس ایک ایک کر کے تار تار ہو جائے

تو ننگا شہر کیسا لگے گا

اُس نے موٹر سائیکل سڑک کے کنارے کھڑی کر دی اور درختوں کے جھنڈ میں گھس گیا، گرمی اور خشکی نے درختوں کے چہروں پر آبلے ڈال دیئے تھے،

فضا میں ایک عجب حبس زدگی تھی

اب تو چند ہی دن کا کھیل باقی رہ گیا ہے ـــــ ننگا شہر کیسا لگے گا

اور میں بھی تو ننگا ہو جاؤں گا

ہاں میں بھی

لیکن میں تو اب بھی ننگا ہی ہوں ـــــ پسینے میں شرابور کپڑوں سے لُو کے بھبھکے اُٹھ رہے ہیں

اُس نے ایک ایک کر کے سارے کپڑے اتار دیئے اور ننگ دھڑنگ ایک درخت کے تنے پر بیٹھ گیا

آسمان گہرے گھنے بادلوں میں چھُپ گیا

لیکن بارش نہیں ہوگی ـــــ بادل تو روز اسی طرح گھر گھر آتے ہیں، لیکن برستے نہیں ـــــ معلوم نہیں وہ شہر سے کیوں اتنا ناراض ہو گئے ہیں؟

ہریالی تو بارش مانگتی ہے ـــــ اور بارش

"بارش نہیں ہوتی ـــــ ہے نا" کسی نے کھنکتی آواز میں اس کا جملہ پورا کیا

وہ اچھل پڑا اور تیزی سے کپڑوں کی طرف بڑھا

وہ سامنے والے درخت کے تنے سے ٹیک لگائے عجب شانِ بے نیازی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی

"میں ـــــ دراصل" وہ ہکلا کر رہ گیا

وہ ہنسی

"بارش نہیں ہوتی"

"ہاں ——"

وہ اس کے قریب آگئی —— اُس کے بالکل سامنے، چند لمحے یونہی کھڑی رہی، پھر دفعتہً اُس نے جانے کیا کیا —— جانے کیا ہوا کہ اس کا سارا لباس پلک جھپکنے میں اس کے بدن سے کھسک کر پاؤں میں آن گرا۔

وہ تو ششدر رہ گیا

کچھ دیر کے لئے سمجھ ہی نہ آیا کہ کہاں ہے —— اور یہ کیا ہوا ہے

وہ اپنے بدن کی ساری توانائیوں اور جلوؤں کے ساتھ سامنے کھڑی مسکرائے جا رہی تھی

اور وہ اس کے سامنے زمین پر یوں پڑا تھا جیسے لڑ لڑ کر ہار گیا ہو

لیکن میں تو ابھی میدان میں اُترا ہی نہیں

وہ چند قدم آگے آئی —— اُسے دیکھتی رہی پھر بولی —— "ہریالی اس شہر سے روٹھ گئی ہے —— ہے نا"

وہ دم بخود اُسے دیکھے جا رہا تھا

"لیکن"

"لیکن کیا؟"

"میں ہریالی ہوں —— میں ہی تو بارش ہوں"

"تم"

"ہاں میں —— تم نے مجھے خود ہی شہر سے نکال دیا ہے، تمہیں میری ضرورت ہی نہیں،"

"نہیں —— نہیں" اُس نے اُچھل کر اسے دبوچ لیا —— "مجھے تمہاری ضرورت

ہے ـــــ مجھے ـــــ مجھے ـــــ"

بادل گہرے ہو گئے ـــ فضا نے آنکھوں میں گہرا سُرمہ لگا لیا ـــ

جانے کتنی دیر گزر گئی

اپنے حواس میں آیا تو وہاں کوئی نہیں تھا ـــــ بس مسلی ہوئی گھاس سے جانے والی کے بدن کی مہک آ رہی تھی،

یہ خواب تھا، یا حقیقت، اُسے کچھ سمجھ نہ آیا

اُس رات خوب بارش ہوئی

ہر چیز دھل گئی ـــ لیکن سب چیزیں بدلی بدلی سی لگتی ہیں

کیا سب کچھ وہی ہے ـــ ویسا ہی ہے

وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا اور پہچاننے کی کوشش کرتا ہے

کچھ پتہ نہیں چلتا ـــ پھروں اور چیزوں پر ایک عجیب منافقانہ مسکراہٹ ہے

اب بارش روز ہوتی ہے، خوب ہوتی ہے لیکن ہریالی میں ایک عجب زردپن ہے جو جاتے نہیں جاتا!

بے دروازہ سراب

اسی چار دیواری میں، غیر منظم طور پر کہانی کہیں چھپی بیٹھی ہے، اور وہ لفظوں کا جال لئے اسے دیر سے تلاش کر رہا ہے، لیکن کہانی بس ایک جھلک دکھلا کر غائب ہو جاتی ہے،

ٹک چھپ جانا
مکئی دا دانہ
راجے دی بیٹی آئی جے

آواز سُن کر چوکنا ہوتا ہے، لفظوں کی ڈوریاں کھینچ کھینچ کر دیکھتا ہے، لیکن کہانی بل کھاتی اس کے پہلو میں سے نکل کر کسی کونے میں جا چھپتی ہے، ایک لمحہ کے لئے خیال آتا کہ کہانی کے بغیر ہی لفظوں کو ایک دوسرے سے جوڑ کر فرضی کہانی بنالی جائے۔

فرضی کہانی بنانے کی کوشش کرتا ہے

لفظ کو دوسرے لفظ سے جوڑتا ہے، لفظوں کا مینار اٹھتا چلا جاتا ہے، جب آخری لفظ رکھتا ہے تو مینار دھڑام سے نیچے گر پڑتا ہے، کونے میں چھپی کہانی کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہے،

لُک چُھپ جانا
مکئی دادانہ
تو کیا کروں ؟
کہانی کو کیسے تلاش کروں ـــــ کہاں سے لاؤں اُسے ؟
مان جاؤ ـــــ آجاؤ، دیکھو لفظ تمہارے انتظار میں مُنہ کھولے بیٹھے ہیں،
کہانی نہیں مانتی ـــــ نہیں آتی،
تو کیا کروں ؟ کہانی کے بغیر ہی کہانی لکھوں،
دُھوپ اندھی، اندھیرا روشن اور لوگ چوہے،
چوُہے سارے صحن میں، گلیوں اور بازاروں میں دوڑتے ہیں، دن روتا ہے،
رات ہنستی ہے، اور کہانی کونے میں چھپی چھپی پتھر ہوتی جاتی ہے،
اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہے اور وہ دونوں ہاتھوں کو پھیلا پھیلا کر ہلا ہلا کر
اسے تلاش کر رہا ہے، کہانی اس کے اردگرد ناچتی ہے، کبھی دائیں، کبھی بائیں گُدگُدی
کرکے بھاگ جاتی ہے۔
وہ دوڑ دوڑ کر ہانپ گیا ہے، پھُولی ہوئی آواز میں کہتا ہے ـــــ "سنُو، خدا
کے لئے سنُو، میری بات تو سنُو"
کہانی کھلکھلاتی ہے ـــــ "کہو"
"میرے پاس آؤ ـــــ دیکھو لفظ اب سڑنے لگے ہیں، ان میں بُو پڑ گئی ہے
ـــــ دیکھو ـــ"
کہانی لمحہ بھر کو چُپ رہتی ہے، پھر کہتی ہے ـــــ "کرداروں کے بغیر میرا
وجود کیا ؟ جاؤ پہلے کردار تلاش کرو"
"کردار" ـــــ وہ بڑبڑاتا ہے ـــــ "لیکن میری آنکھوں پر تو پٹی بندھی ہے"

کہانی کچھ سوچتی ہے پھر چپکے سے اس کی پٹی کھول دیتی ہے

کیا دیکھتا ہے کہ ایک لق و دق صحرا ہے، چار سو ریت کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر،

اُوپر بھونکتا سورج،

وہ آنکھیں جھپکتا ہے

اب کیا دیکھتا ہے کہ بھرا بازار ہے، کھوے سے کھوا چھل رہا ہے، خریداروں کا

ہجوم، دکانیں رنگا رنگ اشیاء سے لدی پڑی ہیں،

کردار ہی کردار،

سامنے سے گزرتے ایک ادھیڑ عمر کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہے ——

"جناب ——"

لیکن اس سے پہلے کہ کچھ اور کہے بازو کندھے سے نکل کر سڑک پر جا گرتا ہے۔

ادھیڑ عمر غصہ سے کہتا ہے —— "معلوم نہیں میرا بازو مصنوعی ہے" وہ بوکھلا کر

بازو اُٹھاتا ہے اور جلدی جلدی کندھے میں فِٹ کرنے لگتا ہے،

بازو فِٹ ہو جاتا ہے تو وہ شخص مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا ہے

"ہاں، اب بتاؤ کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں —— کچھ نہیں" وہ جلدی سے آگے بڑھ جاتا ہے۔ ایک خوبصورت

عورت قریب سے گزرتی ہے۔

"سُنیے"

وہ جواب نہیں دیتی

"سُنیے —— سُنیے —— سُنیے"

وہ مُڑ کر دیکھتی ہے —— "شاید آپ مجھ سے کچھ کہہ رہے ہیں" افسوس میں

سُن نہیں سکتی، میرے کان مرمت ہونے کے لئے گئے ہوئے ہیں، شام کو ملیں گے"

وہ بدک کر دو قدم پیچھے ہٹ جاتا ہے

چاروں طرف کردار ہی کردار ہیں، لیکن ——؟

دفعتہً ایک بچہ نظر آتا ہے،

"یہ ضرور اصلی ہوگا ——"

دوڑ کر اس کے پاس جاتا ہے۔ پیار سے اس کے گال تھپتھپاتا ہے۔ بچہ فوراً بولنے لگتا ہے —— "میرا نام شانی ہے، میرے ابو کا نام ---- میری امی کا نام ---- میں --- میں ----"

آواز بند ہو جاتی ہے

کیا ہوا؟

چابی ختم ہو گئی ہے

وہ دھاڑیں مار مار کے رونے لگتا ہے

"کیا ہوا —— کیا ہوا؟" لوگ اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں، وہ روتے روتے سر اٹھا اٹھا کر دیکھتا ہے،

ٹوٹے بازو —— پتھر کی آنکھیں —— پیوند لگے سر، لکڑی کے پاؤں۔

وہ کتابوں کے ڈھیر میں اتر جاتا ہے

دیمک لگی تاریخ کے ایک ایک واقعہ کو ٹٹولتا ہے، اپنے وقت کے بڑے بڑے کردار تاریخ کے کوڑا گھر میں اوندھے پڑے ہیں، ہاتھ لگاتا ہے تو بھر جاتے ہیں،

وہ پھر اسی چار دیواری میں آ جاتا ہے،

کہانی کسی کونے میں چھپی بیٹھی ہے —— اسے دیکھ کر کھکھلاتی ہے

"میں کیا کروں —— سارے کردار بے کردار ہیں؟"

کہانی ہنستی چلی جاتی ہے، پھر کہتی ہے —— "کردار تو ماحول کی پیداوار

ہیں، جاؤ پہلے ماحول تلاش کرو"

وہ سر ہلاتا ہے اور باہر آتا ہے'

کیا دیکھتا ہے کہ باغ باغیچے ہیں، پھل دار پودے ہیں، رنگا رنگ پھول ہیں'
بھوک سی محسوس ہوتی ہے، آگے بڑھ کر پھل توڑتا ہے، منہ میں ڈالنے لگتا ہے
تو پھل پتھر کا نکلتا ہے'

بازار میں آتا ہے تو دکانیں چیزوں سے بھری نظر آتی ہیں، ہاتھ لگاتا ہے تو مٹی ہو
جاتی ہیں، ڈبوں کے منہ کھولتا ہے تو اندر سے سرانڈ نکلتی ہے ــــ بھوک باؤلے
کتے کی طرح اس کے پیچھے دوڑتی ہے ــــ

بھوک ــــ ڈبے، برتن اندر سے خالی ہیں، باہر سے ٹن ٹنا ٹن بجتے ہیں'
غشی اور کمزوری کے عالم میں تھکن سے چور ڈولتا ہے، ساری چیزیں اڑتی ڈولتی نظر
آتی ہیں'

ایک بڑا سا خلا ہے جس میں وہ بھی ہے، چیزیں بھی، لوگ بھی اور کہانی بھی'
لیکن کہانی کہیں چھپی بیٹھی ہے اور وہ لفظوں کا جال لئے اسے دیر سے تلاش
کر رہا ہے، لیکن کہانی بس ایک جھلک دکھلا کر غائب ہو جاتی ہے۔

لک چھپ جانا
مکئی دا دانہ
راجے دی بیٹی ــــ
مگر راجے کی بیٹی تو راجہ مانگتی ہے اور وہ نہ راجا ہے نہ راجاؤں جیسا!

کھلی آنکھ
میں
تصویر

پہلی، دوسری —— پانچویں اور ساتویں بار وہی منظر،
سردیوں کے پت جھڑ کی ایک بیمار رات،
نیم روشن، نیم تاریک
آسمانوں پر بادلوں کے ٹکڑے جگہ جگہ گھات لگائے چاند کو دبوچنے کے لئے مُنہ کھولے
بیٹھے ہیں۔ ننگے درختوں کی لمبی قطار ——
سڑک پر دُور کہیں کسی کے آنے کی چاپ سر اُٹھاتی ہے۔
مگر کوئی دکھائی نہیں دیتا۔
نہ آتا ہے، نہ چاپ سر جھکاتی ہے۔
بس انتظار کی ایک لمبی مٹیالی چادر، ——
اس وقت کون ہو سکتا ہے؟
کوئی بھی نہیں۔
کوئی تو ہے کہ چاپ سنائی دیتی ہے۔
تو دکھائی کیوں نہیں دیتا۔

رات نیم روشن، نیم تاریک

دکھائی دے بھی سکتا ہے، نہیں بھی دے سکتا۔

مگر ہے کون جو اس وقت چلا آتا ہے؟

قریب ہی کہیں سے کسی پرندے کی پھڑپھڑاہٹ خاموشی کے بلیک بورڈ پر ایک لمبا فقرہ لکھتی ہے!

کسی طرف سے ایک کتا رینگتا ہوا سر نکالتا ہے۔

اور نالی میں سے چپڑ چپڑ پانی پیتا ہے۔

پھر مُنہ اُٹھا کر ہوا میں سونگھتا اور بھونکنے لگتا ہے۔

شاید اس نے بھی چاپ سُن لی ہے،

مگر شاید اُسے بھی کچھ دکھائی نہیں دیتا،

سردیوں کے پت جھڑ کی یہ رات، جس کی عمر معلوم نہیں سر جھکائے آہستہ آہستہ چلی جاتی ہے۔

ننگی شاخوں سے لپٹے گھونسلوں میں دبکے پرندے گردن نکال کر چوری چوری اُسے گزرتے دیکھتے اور اپنے پَروں میں دبک جاتے ہیں۔

گھروں میں آتش دانوں کے آگے، بستروں میں بیتی کہانی اُس ایک جگہ آ رُکی ہے جہاں سے نہ تو واپس جانے کا کوئی راستہ ہے، اور نہ آگے کچھ دکھائی دیتا ہے۔

کہانی کے کردار بے بسی سے چیختے ہیں ـــــ "ہمیں نہ تو کچھ سُنائی دیتا ہے، نہ دکھائی دیتا ہے ـــــ ہمارے راستوں پر دُھند چوکڑی مار کے بیٹھ گئی ہے، ہمیں کچھ سنائی نہیں دیتا، کچھ دکھائی نہیں دیتا ـــــ"

فرض کر لیتے ہیں کہ ان میں سے ایک کردار کا نام الف ہے، اُس کا نام الف کیوں ہے، یہ اُسے معلوم نہیں، بس اُسے الف کے نام سے پکارا جاتا ہے اس لئے وہ الف ہے، ب بھی ہو سکتا تھا اور ج بھی، مگر ہم نے چونکہ فرض کر لیا ہے کہ وہ الف ہے اس لئے وہ الف

اسی ہے۔

تو یہ الف اس وقت، سردیوں کی پت جھڑ کی اس بیمار رات میں، جس کی عمر کا نہ تو اندازہ ہے نہ یہ معلوم ہے کہ وہ کتنا عرصہ یونہی چلتی رہے گی ـــــــ اس سڑک پر جہاں دُور کہیں سے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے، چُپ چاپ کھڑا ہے، اس کے سارے ملنے جلنے والے اس وقت اپنے اپنے گھروں میں آتش دانوں کے سامنے یا بستروں میں کہانی کے اس موڑ کی بھلیوں میں پھنسے ہوئے ہیں، جہاں کہانی نہ آگے جاتی ہے اور نہ پیچھے ہٹتی ہے،

بھونکتا کُتّا چُپ ہو گیا ہے۔

آسمان پر بادلوں کے کھلے مین ہول چاند کو نگلنے کے لئے مُنہ کھولے بیٹھے ہیں، چاند ان سے بچتا بچاتا، پھُونک پھُونک کر قدم رکھتا، چلا جا رہا ہے۔

کسی پرندے کی پھڑپھڑاہٹ، رات کی سلیٹ پر نقش بناتی ہے، کئی پرندے اپنے اپنے گھونسلوں سے گردنیں نکال کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہیں، کُتّا آہستہ آہستہ چلتا الف کے پاس آ کھڑا ہوتا ہے۔

قدموں کی چاپ تیز ہوتی جاتی ہے۔ الف اور کُتّا، دونوں سر اُٹھا کر اُدھر دیکھتے ہیں۔ دُھند میں پہلے ایک نمودار ہوتا ہے، اُس کے بعد دوسرا، پھر تیسرا، چوتھا اور پانچواں ـــــ

"ہالٹ ـــــــ" دُور سے آواز سُنائی دیتی ہے۔

الف دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھا دیتا ہے۔

پانچوں، قریب آ جاتے ہیں۔

"کون ہو تم ـــــــ؟"

الف اپنی زبان کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

"گونگے ہو ـــــ؟"

الف سر ہلاتا ہے۔

"اُور یہ ——" وہ کُتّے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

کُتّے کے کان کھڑے ہوجاتے ہیں، اور وہ دو قدم پیچھے ہٹ کر بھونکنے لگتا ہے۔

پانچوں سر جوڑ کر ایک دوسرے کے کان میں سرگوشیاں انڈیلتے ہیں، پھر ان میں سے ایک جو آگے ہے۔

الف سے کہتا ہے —— "جاؤ —— فوراً بھاگ جاؤ"

الف دبک کر اپنے گھر میں رینگ جاتا ہے۔

پھر وہ کُتّے کی طرف دیکھتے ہیں، جو ابھی تک بھونک رہا ہے اور ان پر حملہ آور ہونے کے لئے پَر تول رہا ہے۔

وہ اپنی بندوقیں سیدھی کرتے ہیں —— تڑ تڑ —— تڑ تڑ

کُتّے کی غراہٹ سسکی میں ڈوب جاتی ہے

عین اسی لمحہ چاند کا پاؤں پھسلتا ہے۔

اور وہ بادلوں کے کُھلے مین ہول میں جا گرتا ہے۔

پانچوں گھُپ اندھیرے میں کھِل کھِل ہنستے ہیں، اور آگے نکل جاتے ہیں

چاپ آہستہ آہستہ ڈوب جاتی ہے۔

پھر کچھ دیر بعد دُور پرے سے ایک اور چاپ سنائی دیتی ہے۔

مگر کوئی دکھائی نہیں دیتا،

یہ سردیوں کے پت جھڑ کی ایک بیمار رات ہے۔

اب بالکل تاریک،

کہ آسماں پر بادلوں کے کُھلے مین ہول میں گرا چاند جانے کس حال میں ہے؟ معلوم نہیں، ننگے درختوں کی لمبی قطار ——

اور خون میں لت پت کُتّا، جس کی کھلی آنکھوں میں منجمد نفرت، تاریخ کے کتبوں کی طرح نقش ہے اور جس کا کھُلا مُنہ اب بھی بھونکنے کی حالت میں ہے،

دُور کہیں، کسی کے آنے کی چاپ سَر اُٹھاتی ہے۔

مگر دکھائی کوئی نہیں دیتا

بس انتظار کی ایک لمبی، اداس سُر ہے۔

مگر گیت کے بول سنائی نہیں دیتے۔

دھند منظر میں رقص

عجب تماشے کی رات ہے،

سورج سوا نیزے سے ابھی ذرا اوپر ہی ہے، روشنی کا لبالب بھرا طشت آسمان کے بیچوں بیچ، عجب پُراسرار روشنی ہے، نہ ٹھنڈی، نہ گرم، بس روشنی ہے، اور روشنی میں چیزیں دروازوں کھڑکیوں اور چھتوں پر بنی ٹھنی بیٹھی ہیں، عجب تماشے کا عالم ہے۔

وجود کی آدھی ٹوٹی ریلنگ سے لٹکا میں جھک جھک کر چیزوں کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہوں، پہلی نظر میں ہر شے اجنبی دکھائی دیتی ہے، قریب سے دیکھتا، سوچتا ہوں تو کچھ کچھ یاد پڑتا ہے لیکن لفظوں کی گرفت میں نہیں آتا۔ عجب بات ہے کہ اس لمحہ ہر شے اپنے خول سے باہر ہے، پہچان دُھندلائی ہوئی ہے اور چیزیں اپنے آپ سے نکل کر پھیلتی گئی ہیں، پھیلتی ہی گئی ہیں،

میں ٹوٹی ریلنگ سے اُتر کر وجود کے پھیلتے تنو پر لیٹ گیا ہوں اور جھک کر نیچے دیکھتا ہوں —— دُور دھندلاہٹوں میں ایک ڈنڈا بردار، جس کا چہرہ اندھیرے میں لپٹا ہوا ہے، زور زور سے ڈنڈا ہلاتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے سامنے بیٹھا بچہ توتلی

زبان میں سبق پڑھ رہا ہے

"میلا نام الفیھ ——— میلے ابُو کا نام بھ، میلے دادا کا نام ———"

ڈنڈے بردار کے چہرے کے گرد لپٹا اندھیرا بہت گہرا ہے، رفتہ رفتہ بچے کی زبان صاف ہوتی چلی جاتی ہے۔

میرا نام و ہے، میرے ابُو کا نام ب ہے، میرے دادا کا نام ———"

میں سر جھٹکتا ہوں ——— کس نے میرا نام و رکھا ہے، نہیں میں اپنی مرضی سے اپنا نام رکھوں گا"

ڈنڈے بردار کی انگارہ آنکھیں کھلتی ہیں، ڈنڈا اُوپر اٹھتا ہے اور ——— درد کی تیز ٹیس میرے سارے وجود میں دوڑ جاتی ہے

نہیں میرا نام و نہیں ———"

ڈنڈا پھر اُوپر اٹھتا ہے،

میرا باپ ب کیوں، ج کیوں نہیں؟"

ڈنڈا اُوپر اٹھتا ہے

"میرا نام و ہے، میرے باپ کا نام ب ہے اور میرے دادا کا نام ———"

و اور ب، ج اور د ——— دن سالوں کے رشتے پھیلتے چلے جاتے ہیں،

لیکن یہ عجب تماشے کی رات ہے

میرا وجود رینگ رینگ کر و اور ب کے بوسیدہ چوغوں سے باہر نکل آیا ہے۔

اس لمحہ کہ چیزیں دروازوں، کھڑکیوں اور چھتوں پر بنی ٹھنی بیٹھی ہیں،

اور سورج سوا نیزے سے ابھی ذرا اُوپر ہی ہے ———

میں نہ و ہوں نہ ب، نہ ج

میں حرف میں ہوں

اور پہچان کے بوسیدہ چوغے گل گل کر نیچے گر رہے ہیں۔ چیزیں ننگی ہوتی جا رہی ہیں۔ ان کے بھی میری طرح کئی نام ہیں، مگر اس رات، کہ عجب تماشے کی رات ہے، ان کے بھی کوئی نام نہیں۔ لگتا ہے ساری چیزیں اپنے اپنے لبادوں سے رینگ رینگ کر باہر نکل آئی ہیں گلے سڑے کپڑوں کا ایک ڈھیر کونے میں لگا ہوا ہے، کوئی اس طرف دیکھتا بھی نہیں۔

ہر شے اپنے ہی تماشے میں محو ہے'

عجب ننگا پن ہے، لیکن ننگا پن نہیں، ایک بڑا سا آئینہ ہے جس میں سب کچھ صاف دکھائی دیتا ہے، ذرا ذرا سا نقطہ، باریک سے باریک لکیر ——— اور پر سورج ہے جو ابھی سوا نیزے سے ذرا اوپر ہی ہے'

میں اپنے وجود کے تنبو سے پھسل کر عین تماشے کے درمیان آن گرتا ہوں۔

تو میں ا نہیں

ب بھی نہیں

ج بھی نہیں

تو میں کون ہوں ———؟

میں صفر میں ہوں

بغیر کسی نام، بغیر کسی چہرے کے

بس میں ——— میں ہوں'۔

میں نہ کسی کو جانتا ہوں، نہ پہچانتا ہوں ———

یہ لمحہ بھی عجب ہے کہ تماشے میں لوگ تو ہیں مگر ایک دوسرے کو پہچانتے نہیں' بس خالی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ کر گزرتے چلے جاتے ہیں۔

"مجھے کوئی پہچانتا ہے" ——— میں چیخ کر پوچھتا ہوں

کئی چہرے اُوپر اٹھتے ہیں، لیکن نہ تو کسی آنکھ میں شناسائی چمکتی ہے، نہ کسی لب پر نام کے حرف سنائی دیتے ہیں،

آنکھیں آنکھیں ہی نہیں

لب لب ہی نہیں

صرف ایک میں ہے جو اُوپر سے نیچے تک، دائیں سے بائیں تک ساری جہتوں میں پھیلی ہوئی ہے،

الف میں

ازل سے ابد تک میں ــــــ میں ہی میں

میں ڈبکیاں کھاتا ہوں، ڈوب ڈوب جاتا ہوں،

سانس رُکنے لگتی ہے، سر اُٹھا کر دیکھتا ہوں، چاروں طرف ایک سمندر ہے، اور میں کچھ بھی نہیں، اس سمندر کے سامنے بالکل کچھ بھی نہیں ـــ بس ڈوبا جا رہا ہوں سانسیں بند ہونے لگتی ہیں، منظر ڈوبنے لگتا ہے، ایک عجب اندھیرا ہے کہ اندھیرا بھی نہیں، مجھے اپنی بُکل میں لپیٹ لیتا ہے،

ایک گہری چُپ!

صبح پہلے تیز گھنٹی پھر کوئی کندھے سے ہلا کر مجھے جگاتا ہے،

"آج دفتر نہیں جانا ــــــ"

"آیئے آیئے مسٹر! آپ کیسے ہیں؟"

"مزاج بخیر ــــــ تشریف رکھیئے نا"

"السلام علیکم ــــــ بہت دنوں بعد دکھائی دیئے"

آؤ بھائی آؤ نا ــــــ"

"بیٹے کیسے ہو؟"

"ابو میری کا پیاں ——"

"جان آج تو بہت دیر لگادی آپ نے۔"

مکالموں کا ایک لامتناہی جنگل، لفظ اُگتے چلے جاتے ہیں،

پھر یہ بھی تو لفظ ہی ہیں!

لفظ، لفظ، لفظ —— بغیر ارادے کے منہ سے نکلتے چلے جاتے ہیں،

مگر وہ رات —— وہ تو عجیب تماشے کی رات تھی، سورج سوا نیزے سے

ابھی ذرا اُوپر ہی تھا، اور ——؟

ایک ذلیل سی، سر سے پیر تک دُھند میں لپٹی صبح،

ہائی وے پر ایک کار ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف دوڑے جا رہی ہے، دونوں شہروں کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کہ ان کے نام اور جغرافیے کیا ہیں اور وہ ایک دوسرے سے کتنے فاصلے پر واقع ہیں؟ چونکہ یہ ہائی وے ہے اور یہاں ہر چیز انتہائی رفتار سے دوڑ رہی ہے، اس لئے یہ کار بھی جس کا رنگ کھتئی ہے پوری رفتار سے دوڑے جا رہی ہے، جس شہر سے آئی ہے اور جس شہر کی طرف جا رہی ہے، دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے بلکہ اور بھی بہت سے شہروں میں کوئی فرق نہیں، اس لئے وہ جس شہر کی طرف جا رہی ہے اس کی بجائے کسی دوسرے شہر کی طرف بھی جا سکتی ہے،

کار میں چار شخص ہیں، جن میں سے ایک مر رہا ہے اور ایک پیدا ہو رہا ہے، باقی دو میں سے ایک گاڑی چلا رہا ہے، معلوم نہیں چلا بھی رہا ہے کہ نہیں، مگر اپنے طور پر وہ یہی سمجھتا ہے، دوسرا موجود ہے، یا شاید موجود نہیں ہے۔ اپنے طور پر اگرچہ وہ بھی خود کو موجود ہی سمجھتا ہے۔ کار میں گھنیری چُپ ہے اور ہائی وے پر دُھند چہل قدمی کر رہی ہے۔ باقی دو میں سے اگلی سیٹ پر ایک ادھیڑ عمر گردن کو شانوں میں دبائے موت کو اشاروں سے

اپنی طرف بُلا رہا ہے۔ اس کے ہونٹوں پر لفظ بارش کے قطروں کی طرح جھلمل کرتے ہیں، لیکن آواز نہیں آتی، اس کے بالکل پیچھے سیٹ پر بار بار اُچھلتا، دُھند میں آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کرتا، خاموشی سے پیدا ہو رہا ہے۔

مرتا ہُوا شخص نم آلُود انگلیوں سے زندگی کے کیلنڈر کو ٹٹولتا ہے، چند دن پہلے کوئی اس کے سارے لفظ اس سے اُدھار مانگ کر لے گیا تھا، اور پھر کبھی واپس نہ آیا۔ کچھ عرصہ وہ لفظوں کے بغیر اشاروں کنایوں سے کام چلاتا رہا، مگر جب چند دنوں کا دائرہ پھیلتا ہی چلا گیا تو اشارے کنائے بھی ختم ہونے لگے۔ لفظوں کے بغیر دم گھُٹنے لگا۔ وہ لفظ مانگنے والے کی تلاش میں ایک شہر سے دوسرے شہر گیا، لیکن وہ نہ ملا، اس جیسے کئی تھے مگر وہ سب اصل کی نقل تھے اور سارے شہر ایک جیسے،

لفظوں کے بغیر زندگی گزارنے کا تجربہ کڑوا اور کسیلا ہوتا ہے۔ اسے بتایا گیا کہ دُنیا کے کئی ملکوں میں لوگ لفظوں کے بغیر ہی رہتے ہیں۔ لیکن اسے سمجھ نہ آیا کہ لفظوں کے بغیر اس کی خوشبو ختم ہو گئی ہے۔ اسے اپنا آپ کُوڑا درم لگتا ہے، جس میں سے بھانت بھانت کی سرانڈ اُٹھتی رہتی ہے اس کے نتھنوں میں خوشبُو کے پھاہے رکھے گئے مگر اب اسے ذائقے میں سرانڈ کا احساس ہونے لگا۔ انہوں نے اس کے کھانے میں خوشبو شامل کر دی تو اسے آوازوں میں سرانڈ محسوس ہونے لگی۔ انہوں نے اس کے کانوں میں بھی خوشبو کے پھاہے رکھ دیئے تو اسے لمس میں سرانڈ آنے لگی، اور اب اسے خیالوں اور سوچوں میں بھی سرانڈ آنے لگی ہے، یہ دیکھ کر انہوں نے اسے مرنے کی اجازت دے دی ہے لیکن موت اتنی کنجوس اور خسیس ہو گئی ہے کہ حاملہ عورت کی طرح پھونک پھونک کر سیڑھیاں اُترتی ہے۔ وہ اسے اشاروں سے بلا رہا ہے، کنایوں سے کہہ رہا ہے، لیکن موت نہ آتی ہے نہ مکالمہ کرتی ہے۔ کہتے ہیں موت مکالمے سے بہت کتراتی ہے، اور وہ مکالمہ کرنا چاہتا ہے، لیکن مکالمے کے لئے لفظوں کی ضرورت ہے اور لفظ اُسی نے کسی کو اُدھار دے دیئے ہیں،

دوسرا شخص آہستہ آہستہ پیدا ہو رہا ہے، اُسے نہ مکالمے سے دلچسپی ہے، نہ لفظوں سے، اُسے

معلوم ہی نہیں کہ اسکے پاس لفظ ہیں بھی کہ نہیں، بس وہ تو اُچھل اُچھل کر دُھند میں لپٹی شبیہوں کو پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اُسے نہ بُو آتی ہے نہ خوشبو،

روشنی ہے تو ٹھیک، نہیں ہے تو بھی ٹھیک

"میں کون؟"

"عامل"

"تم کون؟"

"معمول"

"جو کہوں گا مانو گے؟"

"مانوں گا"

"گھوم جاؤ!"

"گھوم گیا"

"اُن اچکن والے صاحب کی جیب میں کیا ہے؟"

ایک گہری چُپ

"معمول ـــــ معمول ـــــ ارے او معمول، بھائی،

بول تو سہی ـــــ کچھ تو بتا؟"

ایک گہری، گھنیری چُپ

کار چلانے والا ٹھنڈی آہ بھرتا ہے ـــــ "دُھند بڑھتی ہی جا رہی ہے ـــــ عجیب بات ہے جُوں جُوں دن چڑھتا جاتا ہے دُھند کم ہونے کی بجائے بڑھتی ہی جاتی ہے"

مرتا ہوا شخص خالی آنکھوں سے باہر دیکھنے کی سعی کرتا ہے اور شانے ہلا کر چُپ ہو جاتا ہے۔

پیدا ہوتا شخص اُچھل کر شیشہ کھولتا ہے، دُھند کہنی مار کے اندر آنے کی کوشش کرتی ہے، وہ جلدی سے شیشہ چڑھا دیتا ہے اور غوں غوں کر کے سیٹ میں دبک جاتا ہے۔

یاد آیا اسی کار میں ایک چوتھا شخص بھی ہے، وہ چُپ چاپ ونڈ سکرین پر نظریں جمائے بیٹھا ہے، کار چلانے والے کی بات سُن کر وہ لمحہ بھر کے لئے اسے اور باقی دو کو دیکھتا ہے اور دوبارہ ونڈ سکرین پر نظریں جما دیتا ہے۔

کار چلانے والا پھر کہتا ہے — "عجیب بات ہے جُوں جُوں سورج بلند ہو رہا ہے، دُھند کم ہونے کی بجائے بڑھتی ہی جاتی ہے — مجھے تو لگتا ہے یہ سورج کی بجائے کوئی اور چیز ہے۔"

کوئی اس کی بات کا جواب نہیں دیتا۔

ایک کے پاس لفظ ہی نہیں کہ اس نے اپنے لفظ کسی کو اُدھار دے دیئے ہیں، دوسرے کے پاس لفظ ہیں مگر جواب نہیں۔

تیسرے کے پاس لفظ بھی ہیں اور جواب بھی لیکن وہ بولتا نہیں،

ایک عجیب قسم کی ذلیل اور بے غیرت خاموشی چاروں طرف چوکڑی مارے بیٹھی ہے اور کار چُپ چاپ چاروں کو لئے ہائی وے پر ایک شہر سے دوسرے شہر کی طرف دوڑے جا رہی ہے مگر — مگر یہ کسے یقین ہے کہ یہ ہائی وے ہی ہے؟

کیا معلوم؟

رشید امجد کی کائنات

مہدی جعفر

نئے افسانے کے استحکام میں رشید امجد نے جو حصہ لیا ہے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی مساعی نے افسانوی فن کو جلا بخشی ہے۔ رشید امجد کا افسانوی میدان شہری، واردات عصری، محسوسات زخمی، سوچ تفکیری، لہجہ شعری اور اظہار علامتی ہے۔ ان کی توجہ عصری افسانوی ساخت پر مرکوز ہے۔ ان کی کوشش رہی ہے کہ معنوی حیثیت سے وہ عناصر جہت پا جائیں جو موجود تو ہوں مگر گرفت میں نہ آ سکے ہوں، جنہیں لکھا تو جاتا ہو مگر اُبھارا نہ گیا ہو، جنہیں سمیٹ کر لفظ تو دیا جاتا ہو مگر گھیر کر شکل نہ دی جاتی ہو، جن کی کہانی تو کہی گئی ہو، علامتی صورت گری نہ کی گئی ہو۔

معنوی بصارت سے کائناتی بصیرت کے جنم لینے کا منظر رشید امجد کی افسانوی زبان کا امتیازی وصف ہے۔ ان کی پہچان وہ کاوش ہے جو بنے بنائے اور فرسودہ لسانی ڈھانچوں کو ایک ارفع جمالیاتی سطح پر لے جا کر بدل ڈالنا چاہتی ہے اور تازہ اور توانا اسلوب کی تخلیق و تہذیب کرتی ہے۔

موت کھلکھلا کر ہنسی۔ "میں تو تمہارے اندر ہی ہوں۔"

"تو پھر یہ باہر سے کون دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔"

"تم خود۔"

"میں " اس نے بوکھلا کر اپنے سارے وجود کو ٹٹولا۔
وہ کھلکھلا کر ہنسی اور ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی۔
" تو میں اپنے جسم سے باہر ہوں اور موت اندر ہے"
(بے راستوں کا ذائقہ)

رشید امجد ماحول، موقع یا صورتِ حال کو علامت بنا دیتے ہیں۔ ان کے یہاں کردار اہم ہیں مگر اس قدر نہیں کہ اظہار کا سارا زور انہی پر پڑے۔ کردار یا تو عصری پہچان واضح کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں یا بے شناختی کے نشان "بے دروازہ سراب" کا کردار انسانی صفات سے تمیز کرنے کا وسیلہ ہے۔ یہ کردار ایک پورے دور کی دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی سمبالک سچویشن کی شناخت اُبھارتا ہے۔

شہری ماحول کے علامتی بیانیہ کے طور پر رشید امجد "شناسائی دیوار اور تابوت" میں لفظوں کو اشیاء اور گیند کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً جملہ ٹوٹ کر فرش پر گر جاتا ہے تو اسے اُٹھا کر ڈاکٹر کی جیب میں ٹھونس دیتے ہیں۔ وہ اشیاء میں حساسیت بھر دیتے ہیں اور ان میں زندگی اور تحرک جگا دیتے ہیں۔ ماحول میں موجود ارد گرد کی بے جان چیزیں بھی افراد کی طرح عمل اور ردِ عمل کا مظاہرہ کرتی ہیں، جس سے افسانوی بیان میں طلسماتی جان پڑ جاتی ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہاں علامت کو اُبھارنے سے پہلے بیانیہ کو لفظیاتی زیر و بم اور ساختیاتی جست و خیز کے ذریعہ طلسمی کرنے کی ضرورت کیا تھی۔ شاید یہ اس لئے ہوا کہ مایوسی اور زخم خوردگی کا مجرد احساس سادے بیانیہ میں قاری کو غیر دلچسپ اور بے کیف کر دیتا۔ اسے موڑ دینا ہے تو اس کی قلب ماہیت کرنی ہو گی۔

"شناسائی دیوار اور تابوت" کی موضوعی حیثیت بنیادی طور پر عوض سعید کے یہاں "ذات والا اجنبی" کے مماثل ہے۔ البتہ عوض سعید کے افسانے میں تجسیمی یا نامیاتی عمل

مفقود ہے، جو علامتی تشکیل کا باعث ہوتا ہے۔ پھر بھی یہ افسانہ اپنی تجریدی جہت کی بھرپور شناخت مرتسم کرتا ہے۔ حالانکہ رشید امجد کے افسانے کی طرح اس میں بھی ازدواجی زندگی کی مایوسی اور نفسیاتی خلیج ظاہر ہوئی ہے مگر "رات والا اجنبی" کا استعارہ مافوق الفطرت نہیں ہے۔ دوسری طرف رشید امجد کے یہاں اچانک زن وشو کی خلیج سے ایک مافوق البشر ہیولے کی تجسیم افسانے کو علامتی جہت سے ہمکنار کر دیتی ہے۔ یعنی گزرتی ہوئی عمر کے ساتھ عہدِ حاضر کی سچویشن اس طرح مدغم ہوتی ہے کہ عورت کی مرد سے بے اعتنائی اپنا داخلی آہنگ الگ بناتی ہے۔ چنانچہ عجیب الخلقت ہیولے کی تجسیم دراصل زن وشو کی علیٰحدگی کی تجسیم ہے۔ یہ ہیولا ایک ساز بجاتا ہے اور اس کی آواز پر عورت اس وقت رقص کرتی ہے جب مرد موجود نہیں ہوتا۔ اس صورتِ حال کی PLURALITY کو اجتماعی طور پر بھی پہچانا گیا ہے۔ یہ انفرادیت یا فردیت کے اعتبار سے سماج کا حصّہ ہے۔ پڑوسیوں کے یہاں بھی یہ ہیولا دیوار پر بیٹھا ہے اور اس کے ساز پر پڑوسی کی عورت رقص کرتی ہے۔ اگرچہ کہ رشید امجد کی یہ علامت، تجریدی حیثیت کی قلب ماہیت سے تشکیل ہوئی ہے مگر یہ ہیولا سریندر پرکاش کے افسانوی کردار "بجوکا" کے برخلاف کسی خارجی شئے (شئے کی آزادانہ حیثیت) کی داخلی تجسیم نہ ہوکر، داخلی صورت حال (صورتِ حال کی داخلی مگر آزادانہ حیثیت) کی داخلی تجسیم ہے، جسے خارج پر منعکس کیا گیا ہے۔ شہری ماحول کے واسطے سے رشید امجد کی تشکیل کردہ امیج میں اسطوری کردار کم ہے نفسیاتی زیادہ۔ آرکی ٹائپ کے لحاظ سے یہ عورت کا ANIMUS ہے جو پہلے پہل واقعی ہوتا ہے مگر عمر بیتنے کے ساتھ اس کی اصلی صورت عورت کی طرف سے ایک مخصوص طرح کا ردِّ عمل بن کر سامنے آتی ہے اور جس کا خمیازہ مرد کو بھگتنا پڑتا ہے۔ چنانچہ ہیولے میں تاریخیت نہیں بلکہ ازلی کیفیت ہے۔ چونکہ افسانوی سچویشن شہری ہے، اس لئے مکانی طور پر یہ شہر کا سمبل ہے۔

یوں تو رشید امجد علامتی افسانہ نگار ہیں کہ ان کے یہاں کئی جہتوں کے نشیب و فراز سے گزرنے کا عمل ملتا ہے اور تخلیقی شدت ان کے اسلوب اور ہیئت کو اس قدر متاثر کرتی ہے کہ ایک شعری تاثیر بدرجہ اتم پیدا ہو جاتی ہے مگر تمام افسانوں کی بنیادی تخلیقی رد کے طور پر وہ جینے کی زبردست خواہش کے افسانہ نگار ہیں۔

اس نے ایک لمبا سانس لیا اور کہنے لگا۔ "میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔"
(سہ پہر کی خزاں)

میں مڑ کر دیکھتا ہوں۔ میری بیٹی ادھ کھلی آنکھوں میں نیند لئے بازو پھیلائے مجھے بلا رہی ہے۔ میں دھم سے بستر پر گر پڑتا ہوں۔

میں مرنے سے پہلے مرنے کا تجربہ نہیں کر سکتا۔
(میلہ جو تالاب میں ڈوب گیا)

میں اسی تڑپتے ہوئے پتھر کے ساتھ اس کے پاس جاؤں گا اور اس کی سوکھی چھاتیوں سے لپٹ کر — اس سے کہوں گا کہ وہ اپنے بند چشمے اس پر کھول دے۔
(ہابیل اور قابیل کے درمیان ایک طویل مکالمہ)

کوئی ہے۔ کوئی ہے، اس کی اپنی آواز چاروں طرف سے اس پر ٹوٹ پڑتی ہے، وہ نڈھال ہو کر چند قدم پیچھے ہٹ جاتا ہے، بہت دیر تک اسی طرح کھڑا رہتا ہے، پھر اپنے آپ کو اکٹھا کر کے آگے بڑھتا ہے۔ کلاس روم میں ڈیسکوں پر بستے کھلے پڑے ہیں، کاپیاں کھلی ہیں، بلیک بورڈ

پر سوال لکھا ہوا ہے، لیکن نہ پڑھلنے والا موجود ہے نہ
پڑھنے والے، ایک گہری چُپ ہے۔

یا خدا یہ کیا جادو ہے۔ لوگ اس شہر سے کہاں
گئے ہیں۔

ہلکی سی آہٹ ہوتی ہے۔

کون۔ اس کے اندر تجسّس کی پو پھٹتی ہے۔

(قافلہ سے بچھڑا غم)

فرد، اور فرد کی اکائی کے زاویے سے پورے سماج میں زندگی کی طمانیت اور تازگی دیکھنے کی شدید خواہش رشید امجد کو ہولناک صورتِ حال منعکس کرنے پر اکساتی ہے۔ وہ بڑھتی ہوئی بے چہرگی میں شناخت کی راہ تلاش کرتے ہیں اور منجمد اندھیرے میں روشنی کی کرن ڈھونڈتے ہیں مگر انہیں دھوپ میں سیاہ لکیر کے سوا کچھ نہیں ملتا۔

رشید امجد سمجھنے کی قوت پر خاص توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ عقلیت کو وہ اس انتہا پر دیکھتے ہیں جہاں پہنچ کر اسے ناکامی کا سامنا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں جا بجا طنز (SATIRE) کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ وہ مرد کی دلیل پسندی میں اس کی طاقت اور تازگی کو پہچانتے ہوئے اسے ایسے کنارے پر کھڑا دیکھتے ہیں جہاں پر عقلیت کی ہوش مندی اپنی روح گنوا بیٹھتی ہے اور ایک اجاڑپن کا احساس جنم لیتا ہے:

بے چُپ چاپ اسے چائے پیتے دیکھتا رہا۔ اس
نے پیالی میز پر رکھ دی اور ڈوبی ہوئی آواز میں بولا۔ "اس
کے بعد ہم چُپ چاپ اُٹھے خاموشی سے باہر آئے اور
کچھ کہے بغیر اپنے اپنے راستوں پر ہولئے۔"

ب اب بھی چپ رہا۔

"میں کیا کروں؟"

ب کے ہونٹ اس کے چہرے میں دفن ہو گئے۔

"میں کیا کروں؟"

گہری الف خاموشی۔

اس نے ب کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

ب کچی مٹی کے کھلونے کی طرح بھر بھر کر زمین پر بکھر گیا۔

سنسان ویران سڑک پر دھند چپ چاپ قدم قدم چل رہی ہے۔

(سہ پہر کی خزاں)

ایک گہری چپ۔

صبح پہلے تیز گھنٹی۔ پھر کوئی کندھے سے ہلا کر مجھے جگاتا ہے۔

"آج دفتر نہیں جانا؟"

"آیئے آیئے مسٹر الف آپ کیسے ہیں؟"

"مزاج بخیر۔ تشریف رکھئے نا؟"

"السلام علیکم۔ بہت دنوں بعد دکھائی دیئے۔"

"آؤ بھائی آؤ نا۔"

"بیٹے کیسے ہو؟"

"ابو میری کاپیاں۔"

"جان۔ آج تو بہت دیر لگا دی آپ نے"۔

مکالموں کا ایک لامتناہی جنگل، لفظ اُگتے چلے

جاتے ہیں، پھر بھی تو لفظ ہی ہیں۔

لفظ، لفظ، لفظ۔ بغیر ارادے کے منہ سے نکلتے

چلے جاتے ہیں۔

(دھند منظر میں رقص)

دوسری طرف رشید امجد عورت کی ہوشمندی کی ایک الگ سطح کو پہچان لیتے ہیں، جو اپنے مختلف دلائل پر مبنی ہوتی ہے اور جس میں اس کی کمزوری اور طاقت دونوں مضمر ہوتی ہیں۔ ان کے یہاں عورت کا اپنا تعلق مشکوک حیثیت رکھتا ہے، یا محض مرد کی عقلیت کی پرچھائیں اور استخراجی عمل (INDUCTION) سے پیدا ہوتا ہے۔ چونکہ عورت کی ہوشمندی کا سرچشمہ پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے تعلق سے پھوٹتا ہے، اس لئے اس کی مستقل کیفیت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ مرد عورت کے آئینے میں تازگی سے مستفیض ہوتے ہوتے کبھی خشکی اور بے لطفی کا اسیر ہو جاتا ہے اور اپنی شناخت گنوا بیٹھنے کے خطرے سے دوچار ہو جاتا ہے۔ آج کی صورتِ حال اس عمل کو مہمیز کرتی ہے۔

"ایک گھنٹہ تیس منٹ لیٹ"۔

اس نے بے پروائی سے شانے جھٹکے اور بولی۔

"شاپنگ کے لئے نکل گئی تھی"۔

اس کے چہرے پر بہت سے رنگ آنکھ مچولی

کھیلنے لگے۔

"میں"۔

مجھے معلوم تھا تم انتظار کر رہے ہو گے"۔ وہ ہنسی۔

"تم اور کر ہی کیا سکتے ہو"

"تم میری توہین کر رہی ہو"

"میں تو صرف دیر سے آنے کی وجہ بتا رہی ہوں"

"وجہ! خود کو محفوظ رکھنے کی ایک ڈھال۔ ہونہہ"

(سہ پہر کی خزاں)

"میں مر گیا ہوں" اس نے پھولی ہوئی سانسوں میں کہا۔ بیوی کے منہ سے چیخ نکلی، لیکن اگلے ہی لمحہ غصہ کھٹ کھٹ کرتا اس کے منہ پر پھیل گیا۔ "شرم نہیں آتی ایسا مذاق کرتے ہوئے"

"یہ مذاق نہیں" وہ دونوں ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔

"میں سچ مچ مر گیا ہوں"

"کیا بکواس ہے؟" بیوی جھنجھلا گئی۔۔۔

چائے کا آرڈر لے کر بیرا گیا ہی تھا کہ مینجر ان کی میز پر آیا "کون ہو تم؟"

"میں۔ میں ہوں"

"اور یہ عورت؟"

"میری بیوی ہے"

"ثبوت؟"

"بس یہ میری بیوی ہے"

"نکاح نامہ ہے تمہارے پاس؟"

اس نے مُڑ کر بیوی کو دیکھا اور سوچا، اس عورت سے
جو اس کے دو بچوں کی ماں ہے، اس کے تعلقات کیا ہیں۔
وہ اسے مسلسل دیکھتا رہا۔
وہ بولی۔ کیا دیکھ رہے ہو؟"
"کچھ نہیں" وہ بولا۔ پھر کب ملوگی؟"
"کیا؟" وہ چیخ کر بولی "تم مجھے گرل فرینڈ سمجھ
رہے ہو؟"

(بے راستوں کا ذائقہ)

ظاہر ہے عورت کی سوچ سمجھ کا نظام مرد کے اسی طرح کے نظام سے قطعی مختلف ہوتا ہے۔ البتہ دونوں کا نقطۂ اتصال اور قائم مقامی مرد کی فعالیت کی بنا پر ہوتی ہے اور جیسے جیسے مرد بلند فکری پر فائز ہونے لگتا ہے یا اسے حالات کی چکی میں پسنا پڑتا ہے اس کے قدم زمین چھوڑنے لگتے ہیں اور نقطۂ اتصال معدوم ہونے لگتا ہے۔

چنانچہ بیوی کا ذکر جہاں جہاں آتا ہے اس کا خاص انداز ہے۔ رشید امجد عورت کی سمجھ اور مرد کی عقلیت میں دور تک تال میل دیکھنا چاہتے ہیں جو ایک دشوار امر ہے۔ وہ ازدواجی زندگی کے گٹھ جوڑ پر شاید اس لئے زور دیتے ہیں کہ زندگی کی راحت، جینے کی امنگ، اور باہم شناخت کا مسئلہ بڑی حد تک اسی سے متعلق ہے۔

رشید امجد کے افسانوں میں فطری طور پر فرد کے لگاؤ کا عنصر بیوی سے زیادہ بچّی میں ہے۔ بچّی معصومیت کا نشان ہے۔ زندگی سے معصومیت کو شہر بدر کرکے جیا نہیں جاسکتا۔ بر خلاف اس کے معصومیت کے سہارے زندگی گزارنا آسان ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اگلا راستہ معصومیت کے موڑ سے ہی نکلے گا جو GENUINENESS اور خلوص کو ہموار کرے گا۔ مگر فرد زندگی کی چکّی میں اتنا پھنسا ہے کہ وہ معصومیت سے مربوط

ہونے میں دشواری محسوس کرتا ہے۔ عصرِ حاضر کا تناؤ اور دباؤ ایک حدِ فاصل قائم کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے فرد اس قدر الجھا ہوا ہے کہ گھر ہوتے ہوئے بھی گھریلوپن نصیب ہونا ایک مسئلہ بن چکا ہے۔

میں سوچتا ہوں، ہماری قبریں اتنی دُور دُور کیوں ہیں۔
لیکن میری قبر تو میرے ساتھ ہے۔ میں اپنے جسم پر ہاتھ پھیرتا ہوں۔ میری قبر نے مجھے چاروں طرف سے لپیٹا ہوا ہے۔
چاروں طرف قبریں ہی قبریں ہیں۔ مجھے خیال آتا ہے، ب
اب قبر کے قریب ہوگا۔ لیکن قبر کیوں؟ وہ تو اس کا گھر ہے۔
ب گھر سے اتنا ناراض کیوں ہے؟ گھر اسے قبر کیوں نظر آتا ہے؟ میں ماں کے مرنے کی دعائیں کیوں مانگا کرتا ہوں؟
چیزیں الجھنے لگتی ہیں، گھر قبر کیوں بن گئے ہیں؟
ہوٹل گھر کیوں ہو گئے ہیں؟ مجھے کوئی جواب نہیں سوجھتا۔
(بیزار آدم کے بیٹے)

عام طور پر رشید امجد کے افسانوں میں قبر کا وجود کم و بیش مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے موت اور قبر کی استعاراتی حیثیت بڑھ چڑھ کر قائم کی ہے۔ ہر افسانہ اس استعارے کی نئی شناخت لے کر سامنے آ موجود ہوتا ہے۔ یہاں قبر کا استعارہ گھریلوپن کی عدم موجودگی کے خلاء کو بھرتا ہے۔ مرکزی کردار سعی کرتا ہے کہ گھریلوپن کی جنت واپس آجائے، معصومیت پھر اُس کی زندگی میں کھیلنے لگے، وہ معصومیت کی خواہش کو مطمئن کر سکے، مگر فی الحال ایسا ہونا ناممکن نظر آتا ہے۔

وہ سر اٹھاتا ہے تو ناچتا شعلہ گزر چکا ہے۔
آسمان کے طشت کے کناروں سے چاند مُنہ نکال

کر اسے آنکھ مارتا ہے۔

بیوی دروازہ کھولتے ہوئے کوئی سوال نہیں کرتی۔

بیٹی کو گود میں اٹھاتا ہے تو ٹافیاں نہیں مانگتی۔

کھانے میں "کچے" گھی کی ہمک نہیں آتی۔

دیواروں سے سیلن کی بُو بھی نہیں آتی۔

کوئی سوال نہیں۔ کوئی جواب نہیں۔

صبح دفتر جاتے ہوئے مسکراہٹیں۔ ٹاٹا کی چہکار۔

دفتر میں میز پر کوئی PENDING فائل نہیں۔ مسکراہٹیں ہی مسکراہٹیں۔

واپسی پر ٹی ہاؤس میں میز صاف ستھری، کوئی بکھرا ہوا لفظ نہیں۔

گھر آتے ہوئے جب وہ گلی کے نکڑ پر پہنچتا ہے تو دائیں بائیں پھر مڑ کر دیکھتا ہے اور کھلکھلا کر ہنس پڑتا ہے۔

بیوی مسکراہٹ کے چراغ جلائے دروازہ کھولتی ہے۔

بیٹی دوڑ کر ٹانگوں سے لپٹ جاتی ہے۔

(بانجھ ریت اور شام)

رشید امجد کی اہمیت اسی موڑ پر نظر آتی ہے جہاں وہ "کیا ہے" اور "کیا ہو رہا ہے" کی عکاسی کرتے کرتے یکایک "کیا ہونا چاہیئے" کی سمت میں جست لگاتے ہیں۔ انہیں "ان حالات میں کیا ہو سکتا ہے" میں دلچسپی نہیں وہ آج کی صورتِ حال کے بانجھ پن کے درمیان رہتے ہوئے، زرخیزی میں جینے کی طلب

کو جگہ جگہ VISUALISE کرتے ہیں ۔ یہ ایک اہم موڑ ہے ۔

رشید امجد اپنے افسانوں میں مذہبی تلیمحات کا استعمال دو سطحوں پر کرتے ہیں ۔ ایک سطح قدیم اور اوریجنل ہوتی ہے ، اور دوسری سطح عصری ہوتی ہے ۔ تلمیح جب عصری سطح کی نباضی کرتی ہے تو اپنی شکل بدل دیتی ہے یا دوسرے لفظوں میں اپنی قلب ماہیت کر لیتی ہے ۔ رشید امجد جو بات کہنا چاہتے ہیں وہ تلمیح کے TRASFORMATION واسطے سے کہہ جاتے ہیں ۔ وہ عصرِ حاضر کی بگڑی ہوئی حالت کی عکاسی کرتے کرتے ایسی سطح کی نشاندہی کرنے لگتے ہیں جہاں پر تازہ دم ہونے کی گنجائش ہو ۔

"صبر کرو ۔ صبر ۔" میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوں " سارے بچے اب اسی طرح بہتے ہوئے یہیں آئیں گے کہ اب ساری مائیں اپنے بچوں کو یونہی نالیوں میں بہائیں گی ۔"

" نالیوں میں کیوں ؟" وہ چپ ہو کر سوال کرتا ہے ،
"دریا تو سارے خشک ہو گئے ہیں ، اور شہر میں قتلِ طفلاں کی منادی بھی ہو چکی ہے ۔ مائیں بیچاری کیا کریں ۔"
(سناٹا بولتا ہے)

یہاں تلمیح بیانیہ میں تحلیل ہو کر سامنے آئی ہے اور افسانے کی کلیت کا ایک جزو بن گئی ہے ۔ تلمیح کا گھل جانے والا عمل اکثر افسانوں میں دیکھا جا سکتا ہے ۔

ہاں جگانے والا آ گیا ہے ۔ وہ دیکھو ۔
دیکھو لوگ اس کے انتظار میں بارش میں بھیگ رہے ہیں ۔
ہاں ان کے دل مسیح کے ساتھ ہیں ۔ وہ اس کے

منتظر ہیں۔ لیکن، اسے یاد آیا، انہوں نے کہا تھا۔ ہمارے
دل تمہارے ساتھ ہیں، لیکن تلواریں،

افسوس، ہم اپنی تلواریں بیچ چکے ہیں۔
اس نے گھبرا کر اپنی تلوار کو دیکھا۔
لیکن میرے پاس تو تلوار ہے ہی نہیں۔ میری
تلوار تو وہ پہلے ہی چھین کر لے گئے ہیں۔

(بے چہرہ آدمی)

اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟
اذیتیں میرے راستوں کے سبھی موڑوں پر چھپی
ہوئی ہیں، گھات لگائے بیٹھی ہیں، اور میں قطرہ قطرہ مر
رہا ہوں،

میں اس شہر میں جہاں ہر شخص اپنی خوشبو چھوڑ چکا
ہے، اپنے خوشبودار جسم کے ساتھ کیسے رہوں؟
...... تو پھر تم نے کیا سوچا ہے؟
کیا اب بھی بیعت نہیں کرو گے؟

(لا = ؟)

اوپر کے اقتباسات میں روایات کی طرف براہ راست اشارہ نہیں ہے، اس لئے
کہ تلمیح کے عمل اور رد عمل کو پیش کیا گیا ہے، مگر اکثر جگہوں پر باقاعدہ اور واضح طور پر
تلمیح کی کرافٹنگ ملے گی۔

ہم سب کے چہرے کھل اٹھے۔ دیوداسی نے
دونوں ہاتھ باندھ کر ہواؤں میں کسی کو نمسکار کیا اور بولی۔

ہے بھگوان پورس اس دھرتی کا سپوت ہے، تیرا بیٹا ہے، تیری دھرتی کا رکھوالا، اسے شکتی دیجیو۔ ہے بھگوان اسے شکتی دیجیو۔

ہم سب نے سر جھکائے اور اپنے اپنے راستوں پر چل نکلے۔

سکندر کہتے ہیں، میں تجھ سے نفرت کرتا ہوں، میرا ہیرو پورس ہے۔

(سمندر قطرہ سمندر)

اس کی آنکھوں کی کربلا میں بھوک کے پیاسے خیمے ابھر آئے، پیاسے خیموں سے گھوڑا باہر نکلا اور اپنے سوار کو لے کر خون خون میداں میں قدم قدم آگے بڑھنے لگا۔

(ریزہ ریزہ شہادت)

افسانہ "ہابیل وقابیل کے درمیان ایک طویل مکالمہ" کی ساری بنت تلمیحاتی ہے۔ ظاہر ہے رشید امجد تلمیح کے ذریعہ ــــ "آج کی جو بے معنویت کی صورت حال ہے" اسے "معنی کی جو صحیح صورت حال ہونی چاہیئے" ــــ سے ٹکرا دیتے ہیں۔ وہ معنی کی نئی دنیا کو VISUALISE کرتے ہیں۔ اچھی زندگی کو نئی طور پر خلق کرنے کے لئے وہ قدیم سے ربط پیدا کرتے ہیں۔ رشید امجد تلمیح کا استعمال علامتی سطح پر کرتے ہیں، جس میں کبھی کبھی اسطوری سطح نمایاں ہونے لگتی ہے۔

رشید امجد کے یہاں بیانیہ کا الگ نشیب و فراز ہے۔ ان کے اسلوب میں ٹھوس ہیئت نظر نہیں آتی۔ مثلاً جیسی کہ انور سجاد کے یہاں ٹھوس کرافٹنگ ہے، وہ اس طرح کی کرافٹنگ نہیں کرتے بلکہ اپنے افسانوں میں پگھلنے یا گھلنے والی صورت پیدا کر کے

زخمی احساسات اور ماحول کی گرانی کو نہ صرف قابلِ برداشت بناتے ہیں، بلکہ کہیں کہیں لطیف
کیفیت ابھار دیتے ہیں، جس میں طنز کا بھرپور وار ہوتا ہے۔ مثلاً ایک افسانے میں گٹر کا
ذکر کرتے ہیں جس میں ننگ دھڑنگ بچے شپ شپ کرتے دوڑتے چلے آرہے ہیں
ان میں سے ایک بچے سے افسانے کا کردار سوال کرتا ہے۔

مگر تم کون ہو؟

ہم — ہم ربڑ کے غباروں میں پیدا ہوئے ہیں۔ اس گٹر کے اندر۔

ربڑ کے غبارے؟

ہاں۔ وہ غبارے جو لوگ استعمال کر کے گٹر میں پھینک دیتے ہیں۔

(سناٹا بولتا ہے)

اسی طرح ایک اور جگہ بڑی سادگی اور سبک روی کے ساتھ طنز
کچھ اس انداز میں داخل ہوتا ہے کہ افسانہ چلتا رہتا ہے اور طنز دار کرتا جاتا ہے۔

میں، وہ اور دوسرے سب دن کے روشن بازاروں
اور رات کی کالی گلیوں میں اسے تلاش کرتے کرتے اپنے
آپ کو بھی کھو بیٹھے ہیں، اور اب ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں۔

میں کون ہوں؟

تم کون ہو؟

وہ کون ہے؟

وہ جو خوشبو کی طرح محسوس تو ہوتی ہے، دکھائی نہیں
دیتی (لیکن خوشبو تو صرف ان کے لئے ہے جو سونگھنے
کی صلاحیت رکھتے ہیں)

(خواب آئینے)

افسانہ قاری کے ذہن میں تحلیل ہو کر اس طرح اثر انداز ہوتا ہے کہ بوجھ کا احساس نہ ہوتے ہوئے بھی ماحول کا بوجھل پن اسے متاثر کرتا ہے۔ تحلیل ہونے والی ہلکی کیفیت انور سجاد کے افسانوں میں کم کم نظر آتی ہے، اس لئے کہ انور سجاد کے یہاں ماحول کی شدت اور کردار کے بوجھ کو بڑے ٹھوس انداز میں کرافٹ کیا جاتا ہے افسانوی سبک روی رشید امجد کی تخلیق کو شائستہ مزاجی سے ہمکنار کرتی ہے۔

رشید امجد کے یہاں وقت کی صورتِ حال اور عصری حسیت، روزمرہ زندگی کی شناخت یا بے شناختی کے آئینہ میں پورے آب وتاب سے دیکھی جاسکتی ہے۔ نئی تراکیب، نئے الفاظ اور محاورے جوان کے ہاتھ آئے ہیں، بہترین آلے ہیں جن کی نوک سے وہ عصری احساس کو ابھارنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ رشید امجد کے یہاں فرسودہ الفاظ اور پرانے محاوروں کی قلب ماہیت نظر آتی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ انتظار حسین کی داستانوی زبان کے بالمقابل ایک اچھوتی اور عصری زبان خلق کرنے کے امکانات روشن کرتے جارہے ہیں، جس میں داستانوی زبان ہی کی طرح پھیلنے اور بڑھنے کی گنجائشیں بدرجۂ اتم ہوں۔ طلسم سامری کی جگہ اس میں حقیقت خیر۔ قوت نمو ہو۔ ظاہر ہے اس المناک دور میں الف لیلوی زبان کے بالمقابل کربلا کی پیاسی زبان زیادہ معجز۔ نمائی انجام دے سکتی ہے۔

(وہ، الف لیلیٰ کی کوئی کہانی سنا رہا ہوگا۔ کربلا
کی پیاس بھلانے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔
(کالے لفظوں کا پُل صراط)

اس طرح کی معجز۔ نمائی، جو المیہ کے بطن سے پھوٹتی ہے، زبان کو اتنا لچکیلا بنا سکتی ہے کہ ہر چیز۔ اس کی لپیٹ میں آجائے۔ ایسا لگتا ہے رشید امجد کی زبان اپنی جڑوں میں اتر کر بنیاد تلاش کر رہی ہو اور اپنے کھوکھلے پن کو تج کر پھر سے پھوٹ

رہی ہو۔ یہ زبان براہِ راست اور حقیقت خیز امیجز کو محسوس پر منطبق کرتی ہے۔
رشید امجد کی نثر کے چند تخلیقی جملے اور محاورے:

"ڈاکٹر کی آنکھوں میں حیرت کی شمعیں پھڑ پھڑائیں"

پرانا جملہ ہوگا ـــــ ڈاکٹر نے حیرت سے دیکھا

"گھر کی طرف جاتے ہوئے اسے پھر ٹیڑھی
دیواروں اور لمحہ بہ لمحہ سرکتی چھت کا خیال آیا"

پرانا محاورہ ہوگا ـــ پیروں تلے زمین سرکتی نظر آئی۔

"اس کی بیوی نے بات کو سمیٹ کر نالی میں پھینک دیا
اور بولی ـــ دفتر دیر ہو رہی ہے"

پرانا محاورہ ہوگا ـــ بیوی نے سُنی اَن سُنی کر دی۔

ایسا نہیں کہ رشید امجد پرانے محاورے استعمال ہی نہیں کرتے یہ ضرور ہے کہ وہ انہیں تخلیقی طور پر حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ آگے چل کر اوپر والے ایک محاورے کو اس طرح تحلیل کرتے ہیں۔

"اگر وہ دیواروں اور چھت کا ذکر کرتا ہے تو ان سُنی
کر کے بے شمار مسئلوں میں سے کسی کا ذکر چھیڑ دیتی ہے"

کچھ اور جملوں میں محاوروں کا استعمال ـــــ

"اس نے سوچا، یہ لوگ ضرورت کی منہ زور چڑیلوں
سے بھاگ کر شہر چھوڑ جاتے ہیں، باہر جا کر محنت کی چکیوں
میں پلتے ہیں اور پھر جب واپس آتے ہیں تو ان کے بٹوے

پھُولے ہوئے ہوتے ہیں "

" سورج کی کرنوں میں جوانی کا گرم خون دوڑنے لگا

ہے۔ وہ جسموں میں چٹکیاں لینے لگی ہے "

افسانہ "میلہ جو تالاب میں ڈوب گیا" میں انہوں نے لفظ "خودکشی" کو فرسودہ اور رکھو کھلا جان کر استعمال کرنے سے پرہیز کیا ہے۔ اسے انہوں نے گھیر کر "مرنے سے پہلے مرنے کا تجربہ" کہا ہے جس سے معنوی وسعت میں اضافہ ہوا ہے۔ سارے افسانے کو اگر فرسودہ زبان میں لکھا جائے تو شاید افسانہ باقی نہ رہے۔ اس طرح کی اچھُوتی تشبیہات، نئے محاورے یا انوکھی تراکیب استعمال کر کے رشید امجد نے اپنے افسانوں میں جان ڈال دی ہے۔ وہ خیالات اور امیجز کے ادغام سے علامتی زبان خلق کرتے ہیں، مرئی اور غیر مرئی الفاظ کا سٹیکس بناتے ہیں، اور جزو جزو علامتی اشاروں کے بل بوتے پر اس پوری علامت کا احاطہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جس کی طرف افسانہ لپکتا ہے۔

رشید امجد کے یہاں جو کرافٹ مین شپ ہے، اس میں سوچ اور سامنے کے منظر کی بُنت ہے۔ سوچ میں ماحول کی غیر مرئی خصوصیات اور تفلسف کا ملا جُلا سلسلہ ہوتا ہے۔ منظر میں کانکریٹ امیجز ہوتی ہیں ایسا لگتا ہے جیسے سامنے کا گزرتا یا ٹھہرا ہوا منظر، سوچ کے لئے مواد کا کام دے رہا ہو، اور فنکار اسے تخلیق میں ڈھالتا چلا جا رہا ہو۔

دوسری طرف کرافٹنگ کرنے میں بات سے بات کے بجائے زیادہ تر بات سے سوچ نکلتی ہے، اور سوچ سے احساسات کی رو جو صورت حال کو تخلیقی طور پر سامنے لاتی ہے۔ عام گفتگو میں کوئی شخص اگر بات کرتے کرتے یکایک چُپ ہو جائے تو دُوسرے سُننے والوں کے ہاتھ چند کہی ہوئی باتوں کے سوا کچھ نہ آئے گا۔ ہاں چُپ کے

دوران سوچنے کا جو تسلسل بنا رہتا ہے اگر فنکار الفاظ میں اس کا احاطہ کر لے تو اس طرح دو باتوں کے درمیان والی خاموشی کے زمانی خلاء کا احتساب بھی ہو جائے گا اور سوچ کا وقفہ کرافٹ بھی ہو جائے گا۔ اس تکنیک سے صورتِ حال میں اُبھار پیدا ہوتا ہے اور علامتی کیفیت، جو فنکار پیش کرنا چاہتا ہے، اس پر گرفت مضبوط ہوتی ہے۔ رشید امجد کے یہاں اسی دھوپ چھاؤں کی کیفیت میں سوچ اور احساسات نئی نئی سمتوں میں لپکتے ہیں اور افسانے کے علامتی کل کو لپیٹ میں لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر افسانہ "سہ پہر کی خزاں" ہے، جس میں موجودہ سے ماضی کی طرف لوٹ جانے کے عمل میں جو سوچ اُبھرتی ہے وہ کچھ ایسی ہی ہے۔ راوی باتیں کرتے کرتے اچانک ماضی میں غرق ہو جاتا ہے، پھر ہوش اسی وقت آتا ہے جب ملازم وارد ہو کر سکوت توڑ دیتا ہے۔

"بیگم صاحبہ کھانے کی میز پر آپ کا انتظار کر رہی ہیں"

یہ جملہ اُسے پھر استغراق کے عالم میں پہنچا دیتا ہے۔ جملہ کے ردِّ عمل سے صورتحال کے ادراک میں اضافہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے رشید امجد کے یہاں ماضی کے استغراق اور بیوی کے ردِّ عمل میں فرد کی شناخت کا مسئلہ مناسب ترین معنویت کے ساتھ کرافٹ کیا جاتا ہے۔

"نمبر" بوڑھے اکاؤنٹنٹ نے عینک کے دھندلے شیشوں میں سے اُسے گھورا۔

"ETE - 23704"

اکاؤنٹنٹ نے پے رول پر نشان لگایا اور تنخواہ کا ٹوکن اس کی طرف لڑھکا دیا۔ نوٹ گنتے ہوئے اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں لین دین کے پورے صفحے کو جلدی جلدی جمع

تفرلق کیا اور دس دس کے دو نوٹ نکال کر پتلون کی پچھلی

جیب میں رکھ لیے۔

"تو آج تمہیں تنخواہ ملی ہے۔" وہ مسکرائی۔

"ہاں ۔ اور بڑی مشکل سے بیس روپے بچا سکا ہوں۔"

"تم بے وقوفی کی حد تک صاف گو ہو۔" وہ آہستہ

سے بولی۔

"یہ اچھی بات نہیں۔"

یہ حصہ افسانے میں الگ سے کرافٹ کیا گیا ہے۔ سوچ کا یہ ٹکڑا افسانے کی تھیم سے الگ نہیں۔ افسانے کے اس طرح کے PASSAGES کے درمیان خطِ فاصل کھینچا جا سکتا ہے جو لمحہ گزراں کے ساتھ بدلتے ہوئے احساسات اور ردِ عمل کو الگ کرتے ہیں یا ماضی اور یادوں کو سوچ کی مختلف پرتوں میں اُتارتے ہیں۔ میرا خیال ہے ان افسانوں میں شعری STANZAS کی کرافٹ البتہ افسانے کو افسانے سے دُور کرتی ہے۔

رشید امجد کے اظہار کا ایک خاص آلۂ کار مکالمہ ہے۔ میرا خیال ہے مکالمے یہاں دوہرے کا کام کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ استغراق کے عالم میں بھی مکالمے اُبھرتے رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں توجہ کے لائق افسانہ "نارسائی کی مٹھیوں میں" ہے جس میں پس منظر بدلتا ہے، مختلف کردار آ آ کر مکالموں سے جڑتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں مگر مکالموں کا فکری تسلسل نہیں ٹوٹتا۔ ایسا لگتا ہے جیسے سب کچھ مکالموں سے ہی تفاعل کر رہا ہو۔ بدلتے ہوئے ماحول اور بدلتی ہوئی سوچ کا تصادم مکالموں سے ہوتا ہے جو عموماً حقیقی اور ٹھوس ہوتے ہیں جس کی وجہ سے حقیقت اور خواب آپس میں گُتھے نظر آتے ہیں۔

مکالموں کی شکل کبھی داخلی ہوتی ہے کبھی خارجی۔ اسی طرح جیسے مناظر کی حیثیت کبھی خارجی کبھی داخلی ہوتی ہے۔ جب مکالموں کی صورت خارجی ہوتی ہے تو ان کی خارجیت صاف پہچانی جاسکتی ہے۔ انہی کی راہ سے فنکار اور قاری دونوں خارجی دُنیا سے متعلق ہو جاتے ہیں۔ خارجی مکالموں کا رویّہ کچھ اس طرح نظر آتا ہے جیسے کوئی شخص پانی میں غوطہ لگانے کے بعد سطح پر ابھرے، ہوا میں سانس لے، ایک نظر باہر ڈالے، پھر ڈُبکی لگا دے۔

داخلی حیثیت سے مکالموں کی تین صورتیں ہیں۔ ایک وہ جبکہ وہ اپنی صحیح شکل میں یاد آتے ہیں۔ ایک وہ جو داخلی تخلیقی تفاعل کے باعث ٹوٹ پھُوٹ جاتے ہیں اور اپنی شکل بگاڑ لیتے ہیں۔ تیسری شکل یہ ہے کہ مکالمے نہ باہر سے امپورٹ ہوتے ہیں، نہ یادوں کے ذریعہ وابستہ ہوتے ہیں، بلکہ داخل میں اپنے آپ بن جاتے ہیں۔ ایسے مکالموں سے رشید امجد صورتِ حال کا گہرا عکس منقش کرتے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ رشید امجد جیسا فنکار اپنا قاری آپ پیدا کرنے کی راہ اپناتا ہے۔ یہ کڑی منزل یقیناً حالی کے دور سے آگے کی منزل ہے۔ حالی کے "جمہور" اور آج کے قارئین میں فرق یہ ہے کہ حالی "جُمہور کا دل" جُوں کا تُوں قائم رکھتے ہیں، اس میں تبدیلی کی گنجائش نہیں نکالتے۔ کیا "جمہور کا دل" "نئے آہنگ کے اعتبار سے بدلتا نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ عصرِ حاضر کا فنکار نیا "جمہوری" ربط خلق کرنا چاہتا ہے۔ یہی وہ میدان ہے جہاں قدیم ڈھانچے نئی لسانی تخلیقات سے مات کھا سکتے ہیں۔

1820
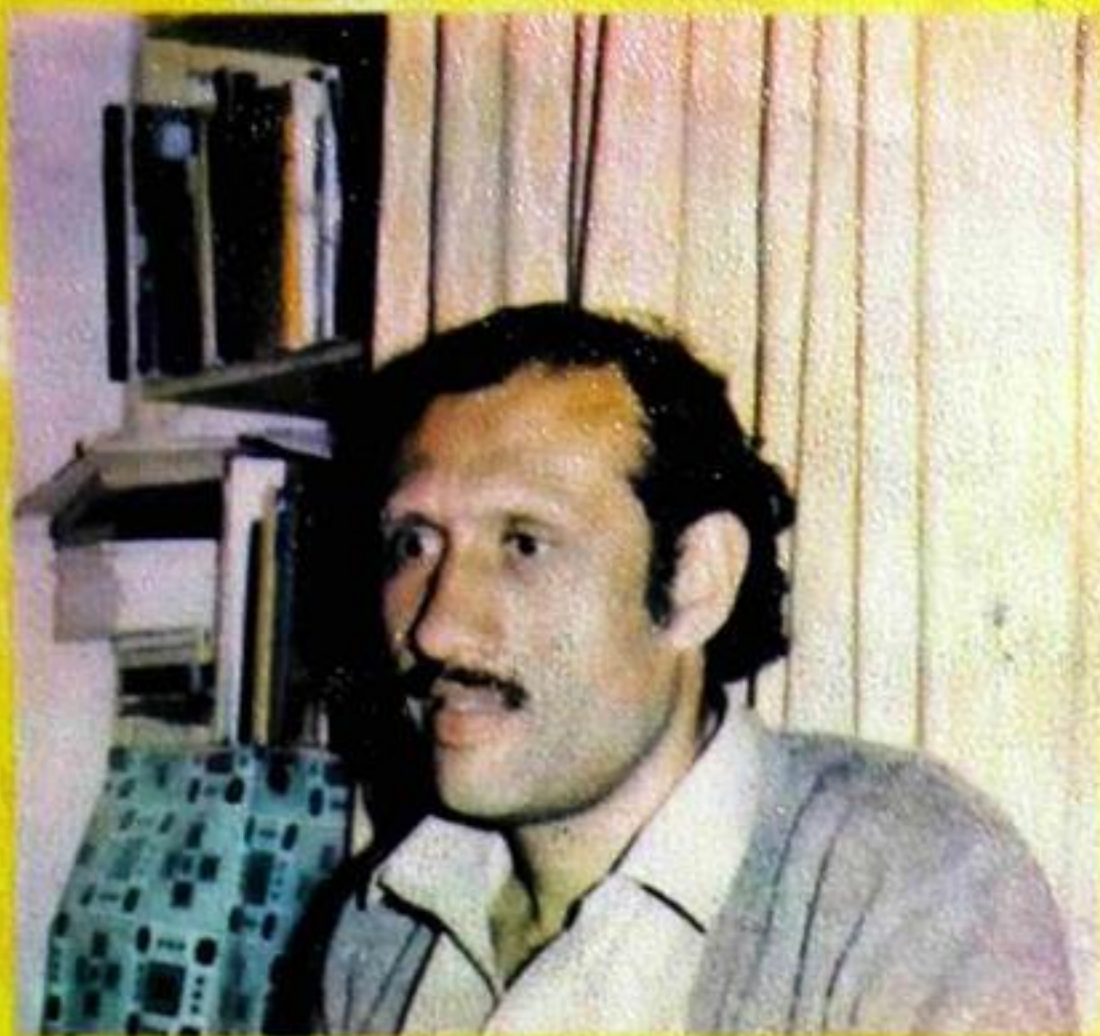
Rasheed Amjad is certainly the most conspicuous and consummate artist amongst our Urdu short story writers. He has developed an essentially dramatic method of portraying characters; and finally, he has acquired a distinct style free from his earlier ornate and belaboured diction.

Besides the socio-political situation and a corresponding change in his attitude and outlook to life and literature, the major role in bringing about a significant change in his stories is played by the cautious and careful handling and usage of words. Here, the multiplicity of linguistic possibilities is exploited by him with utmost economy, reminiscent of the renowned English Imagist. Like them his diction is now fully charged with meanings and feelings.

The Muslim, Friday May 23, 1980.